بسم اللہ الرحمن الرحیم

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ **الشریعہ** گوجرانوالہ

جلد: ۲۴ ○ شمارہ: ۵ ○ مئی ۲۰۱۳ء

بیاد: حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ / حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

رئیس التحریر
ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر
محمد عمار خان ناصر

مجلس تحریر
پروفیسر غلام رسول عدیم
پروفیسر میاں انعام الرحمٰن
پروفیسر محمد اکرم ورک
مولانا حافظ محمد یوسف
چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ
حکیم محمد عمران مغل
شبیر احمد خان میواتی

انتظامیہ
ناصر الدین عامر / عبد الرزاق
حافظ محمد سلیمان / حافظ محمد طاہر

○

کلمہ حق

قومی نصاب تعلیم میں اصلاح وترمیم — رئیس التحریر — ۲

آرا وافکار

امام شافعیؒ اور ان کا تجدیدی کارنامہ — ڈاکٹر غطریف شہباز — ۷

مسلم نشاۃ ثانیہ: اصلاح مفاہیم — احمد جاوید — ۱۷

مباحثہ ومکالمہ

امیر عبد القادر الجزائری کون تھے؟ — ابو عمار زاہد الراشدی / مولانا عبد القیوم حقانی / عمار ناصر — ۲۳

جعلی مجاہد کی اصلی داستان — مفتی ابولبابہ شاہ منصور — ۳۱

الجزائری کی داستان حیات۔ چند توضیحات — محمد عمار خان ناصر — ۳۸

مکاتیب — ڈاکٹر ممتاز احمد / امتیاز احمد — ۴۳

اخبار وآثار

الشریعہ اکادمی کا دورۂ تفسیر۔ مشاہدات وتاثرات — محمد بلال فاروقی — ۴۸

امراض وعلاج

خسرہ کا مجرب علاج — حکیم محمد عمران مغل — ۵۷

○

زر تعاون	خط وکتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 250 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعہ اکادمی	حافظ محمد طاہر
بیرون ملک سے	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
25 امریکی ڈالر	aknasir2003@yahoo.com	www.alsharia.org	0306-6426001

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد ۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

کلمہ حق

رئیس التحریر

قومی نصاب تعلیم میں اصلاح وترمیم کا مسئلہ

۲۲/اپریل ۲۰۱۳ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع قومی نصاب تعلیم میں اسلامیات کے مضامین اور مواد کو کم کرنے اور نصاب تعلیم کو مبینہ طور پر سیکولر نصاب تعلیم کی شکل دینے کے بارے میں بعض اخباری رپورٹوں کا جائزہ لینا تھا۔ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر عبد الماجد حمید المشرقی نے سیمینار کی صدارت کی اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہ نما مولانا اللہ وسایا مہمان خصوصی تھے۔ سیمینار میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ مولانا محمد قاسم، مولانا غلام نبی، مولانا محمد عثمان، حافظ محمد عمار خان ناصر، مولانا محمد فخر عالم، مولانا محمد عبد اللہ راتھر، پروفیسر حافظ محمد رشید اور راقم الحروف نے بھی گفتگو کی جبکہ مجموعی طور پر اس گفتگو میں مندرجہ ذیل نکات سامنے لائے گئے:

---o نصاب تعلیم کے حوالے سے جن امور کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ان کے مختلف دائرے ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور قومی نصاب تعلیم کس حد تک ملک کی نظریاتی اساس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہماری قومی تعلیمی ضروریات کیا ہیں اور مذہب وثقافت کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، سول سروس، ملٹری، معیشت اور دیگر شعبوں کے تقاضوں کو یہ تعلیمی نصاب ونظام کس حد تک پورا کرتا ہے، اور تیسرا یہ کہ موجودہ عالمی تناظر میں ملک وقوم کی بین الاقوامی ضروریات کیا ہیں اور ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو پورا کرنے میں یہ قومی نصاب تعلیم کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

اس کے بعد دوسری سطح یہ ہے کہ متعدد حوالوں سے تعلیمی نصاب ونظام کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے جو شکایات وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں اور اس وقت بھی قومی اخبارات میں موضوع بحث بنی ہوئی ہیں، ان کی اصل صورت حال کیا ہے اور ان کے بارے میں اعتدال وتوازن کی راہ کیا ہے؟

---o قومی نصاب تعلیم کے بارے میں اس وقت دو قسم کی کشمکش چل رہی ہے، ایک کشمکش تو مذہبی اور سیکولر حلقوں کے درمیان ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل جاری ہے۔ دونوں حلقے اس سلسلہ میں اپنی قوت اور اثر ورسوخ کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اب بھی یہ کشمکش عروج پر ہے۔ دوسری کشمکش وفاق اور صوبوں کے درمیان ہے۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد نصاب تعلیم کا معاملہ صوبوں کے سپرد ہوا ہے جو پہلے وفاق کی ذمہ داری اور اختیار کا حصہ تھا۔

صوبوں کو منتقل ہو جانے کے بعد بھی وفاق ان معاملات کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے مگر صوبوں کا کہنا ہے کہ جب تعلیمی نظام کے معاملات دستور کے مطابق صوبوں کو منتقل ہو چکے ہیں تو انہیں پوری آزادی کے ساتھ اس بارے میں کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کشمکش کچھ عرصہ تو چلتی رہے گی مگر بالآخر یہ معاملات صوبوں کے دائرہ اختیار میں آ جائیں گے۔ ہمیں تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

---o بسا اوقات تبدیلی اور ترمیم کرنے والوں کے ذہنوں میں وہ بات نہیں ہوتی جو اس پر اعتراض کرنے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً خیبر پختون خواہ کی سابقہ حکومت کے دور میں نویں دسویں کے نصاب سے سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ کو نکالنے والوں کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے ان سورتوں کو نصاب سے خارج کرنے کی بات نہیں کی بلکہ ترتیب بدلنے کی بات کی ہے کہ اس سطح پر سورۃ الحجرات کی تعلیم زیادہ مناسب ہے اور اس کے اوپر کے درجات میں یعنی انٹرمیڈیٹ کی سطح پر سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ اگر فی الواقع ایسی بات ہے تو اس پر اعتراض کرنے کی بجائے اس کی افادیت اور موزونیت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

---o ہمارے نصاب تعلیم کے بارے میں بین الاقوامی ایجنڈا اور اس کے لیے مسلسل دباؤ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ باخبر حضرات کے مطابق عالمی اداروں کی طرف سے تعلیمی شعبہ میں جو امداد دی جاتی ہے اس کے ساتھ متعین شرائط ہوتی ہیں کہ یہ امداد تعلیمی نصاب و نظام میں حسب شرائط تبدیلیوں کی صورت میں ہی ملے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بھی اربابِ حل وعقد کو بعض تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں، ایسی شرائط کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے کونسی شرائط اور تبدیلیاں ہمارے دینی اور قومی تقاضوں سے متصادم ہیں۔ ان کی نشان دہی اور ان کی روک تھام کے لیے قوم کی راہ نمائی اور مناسب تدابیر بھی ضروری ہیں۔

---o دینی مدارس کے نصاب و نظام کے حوالہ سے عصری و قومی تعلیمی ادارے مسلسل اپنی رائے دیتے رہتے ہیں اور دینی مدارس کے وفاقوں کو اپنے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں قومی تعلیمی اداروں کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے جو ایک اچھی بات ہے۔ اسی طرح قومی تعلیمی نظام و نصاب تشکیل دینے والوں کے لیے بھی یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ تعلیمی نصاب کے دینی پہلوؤں کے حوالہ سے دینی مدارس کے وفاقوں کو اعتماد میں لیں اور ان کی مشاورت کے ساتھ یہ معاملات طے کریں تاکہ باہمی اعتماد میں اضافے کے ساتھ ساتھ متعلقہ معاملات بھی صحیح رخ اختیار کر سکیں۔

---o جب سے پرائیویٹ پبلشرز کی شائع کردہ کتابیں نصاب تعلیم کا حصہ بننے لگی ہیں، اس خلفشار میں اضافہ ہوا ہے۔ بڑے پبلشرز نے اپنے اپنے تعلیمی بورڈ بنا رکھے ہیں جو کتابیں مرتب کرتے ہیں اور جس کی کتاب سکولوں میں چل جاتی ہے، وہ اس دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں۔ اس سے تعلیمی نصاب میں ہم آہنگی مفقود ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر پبلشنگ ادارے کے تعلیمی بورڈ کی اپنی پالیسی اور ذوق ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو بھی کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہر سطح پر مشترکہ تعلیمی کمیٹیوں کا قیام مناسب بات ہوگی۔

---o اندرونی حلقوں کے مطابق بسا اوقات ملازمین کے بعض ذاتی معاملات کی وجہ سے اس قسم کی شکایات

سامنے آتی ہیں اور انہیں اجاگر کیا جاتا ہے، اس لیے یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ایسی شکایات کا داخلی پس منظر کیا ہے اور حقیقی صورت حال کیا ہے۔

---o نصابِ تعلیم کے اسلامی مضامین اور دینی مواد کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین کے مواد کے بارے میں بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً کائنات کی تخلیق اور ارتقاء اور مغربی فلسفہ کے دوسرے بہت سے پہلوؤں کا ہمارے اعتقاد و ایمان کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور بعض مضامین ایسے پڑھائے جا رہے ہیں جو مسلّمہ اسلامی اعتقادات سے ٹکراتے ہیں جس سے مسلم طلبہ کے ذہنوں میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جائزہ میں قومی نصاب تعلیم کے تمام شعبوں کو شامل کرنا چاہیے اور ایسے امور کی نشاندہی کرنی چاہیے۔

---o اس سلسلے میں ملک کے مختلف شہروں میں کام ہو رہا ہے اور بہت سے ارباب دانش محنت اور ذہن سازی کر رہے ہیں، ان کے درمیان باہمی رابطہ ضروری ہے تاکہ ایک دوسرے کی محنت اور کام سے استفادہ کر کے ایک مجموعی موقف سامنے لایا جائے اور پھر اس کے لیے مربوط جدوجہد کا لائحہ عمل طے کیا جائے، وغیر ذلک۔

شرکاء کی طرف سے اظہار خیال کے بعد سیمینار میں یہ طے پایا کہ (۱) پروفیسر حافظ عبد الرشید (مرے کالج سیالکوٹ) (۲) مولانا محمد فخر عالم (مسلم سٹوڈنٹس آرگنائزیشن) اور (۳) جناب علی رضا شیخ ایڈووکیٹ (پریمیئر لاء کالج گوجرانوالہ) پر مشتمل ورکنگ گروپ قائم کیا جائے گا جو پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم ورک، پروفیسر ڈاکٹر عبد الماجد حمید المشرقی اور حافظ محمد عمار خان ناصر کی نگرانی میں ان امور کا جائزہ لے کر ایک جامع رپورٹ مرتب کرے گا اور اس رپورٹ کی بنیاد پر ملک کے سرکردہ اربابِ علم و دانش اور علمی و فکری اداروں کے ساتھ رابطہ و مشاورت کی کوئی عملی صورت اختیار کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمار خان ناصر اور اس کے ناقدین

''محترمی و مکرمی و مخدومی وجبی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد!

کچھ عرصہ سے اخبارات اور جرائد میں حضرت والا کے فرزند ارجمند کے نظریات و رجحانات پر کچھ علماء و اہل قلم اپنے اپنے انداز میں تحفظات بلکہ واضح انداز میں تنقید و اعتراضات رقم کر رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان محررین کی آپ کے صاحبزادے سے ملاقات اور آمنے سامنے گفتگو بھی ہوئی یا نہیں، کیونکہ حق تو یہ ہے کہ صاحب کلام سے اس کے کلام کی توضیح پوچھی جائے، لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ ''عیاں راچہ بیاں'' اور صریح بات میں نیت نہیں پوچھی جاتی۔ ممکن ہے کہ ناقدین و جارحین نے صاحبزادہ کے کلام میں اسی وجہ سے ان سے وضاحت لینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو، لیکن بہرصورت 'صاحب البیت ادریٰ بما فیہ' کے تحت اس سب کچھ کو آپ سے بڑھ کوئی نہیں جان سکتا۔

آپ حضرات کی دعاؤں سے بندہ کی یہ طبیعت ہے کہ ایسے کسی مسئلہ میں جب تک خود صاحب واقعہ یا اس کے

انتہائی قریبی شناسا سے بات چیت نہ ہو جائے، اپنی حتمی رائے قائم نہیں کرتا بلکہ سرے سے اس میں گفتگو اور بحث ومباحثہ ہی نہیں کرتا۔ آج کل مدارس میں بین الاساتذہ وبین الطلبہ یہ گفتگو کثرت سے چل رہی ہے۔ بندہ ہمیشہ ہی خاموشی سے ایک طرف اور کنارہ کش ہو جاتا ہے، لیکن دل میں کسک بہرحال رہتی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے ذریعے سے یہ بھی ختم ہو جائے گی۔

بندہ عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

مدرس جامعہ حنفیہ، بورے والا''

''محترمی مولانا عبدالرحمٰن صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ مزاج پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ رائے کا اختلاف، تحقیق سے پیدا ہونے والا اختلاف اور علمی مسائل میں تحقیق وتجزیہ کا معاملہ ذاتی پسند وناپسند اور مخالفت وعناد کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور ہم جس سے کسی مسئلہ پر اختلاف کرتے ہیں، اسے کسی نہ کسی دشمن کا ایجنٹ اور گماشتہ قرار دیے بغیر خود اپنے موقف کی سچائی پر ہمارا اعتماد قائم نہیں ہوتا۔

تحریک پاکستان میں قیام پاکستان کی حمایت ومخالفت میں دونوں طرف ہمارے بزرگ تھے اور ارباب علم وفضل تھے، مگر اس دور کا لٹریچر ایسے الزامات سے بھرا پڑا ہے جس میں ایک جانب کے بزرگوں کو ہندوؤں کا ایجنٹ کہا گیا اور دوسری طرف کے بزرگوں کو انگریزوں کا آلہ کار قرار دیا گیا ہے۔ ۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ لگایا جس پر بہت سے بزرگوں نے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس فتویٰ سے حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دیگر سیکڑوں علماء کرام نے اختلاف کیا کہ اسے اصطلاح وتعبیر کی غلطی تو کہا جا سکتا ہے، مگر اسے کفر قرار دینا درست نہیں ہے۔ اس اختلاف پر ہمارے ان بزرگوں کو ''سوشلسٹ علماء''، ''سرخ ملا'' اور کمیونسٹوں کے ایجنٹ کے جن خطابات سے نوازا گیا، اس کی بھرمار کی ایک جھلک اس دور کے دینی جرائد میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ابھی چند سال قبل حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اسلامی بینکاری کے بارے میں اپنا اجتہادی نقطہ نظر پیش کیا تو اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سیمینار میں ملک کے ایک مقتدر دانش ور نے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ عالمی یہودی سرمایہ داروں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں جس پر میں نے اسی محفل میں اس طرز عمل سے اختلاف کیا کہ کسی علمی اختلاف پر اس قسم کا رویہ اختیار کرنا درست نہیں ہے اور الزام تراشی اور طعن وتشنیع کی زبان قطعی طور پر علمی زبان نہیں ہے، مگر یہ رویہ جو قطعی طور پر غیر علمی اور غیر شریفانہ طرز عمل ہے، ہمارے ہاں مزید پختہ ہوتا جا رہا ہے اور اسے ہمارے بعض جرائد پروان چڑھانے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

عزیزم عمار خان سلمہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کتاب کی دنیا کا آدمی ہے، مطالعہ وتحقیق اس کا ذوق ہے اور علمی مسائل پر

گفتگو اس کا معمول ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس کوچے میں قدم رکھے گا اور آگے بڑھے گا، اسے کسی مسئلہ پر اختلاف بھی ہوگا اور وہ اس کا اظہار بھی کرے گا۔ اس کا حل طعن وتشنیع، فتویٰ بازی اور الزام تراشی نہیں ہے بلکہ علم وتحقیق کی زبان میں اس سے اختلاف کرنا ہے اور میں خود بھی بعض مواقع پر اس سے اختلاف کرتا ہوں۔

میرا ذوق یہ ہے کہ جہاں خود اختلاف کا حق استعمال کرتا ہوں، وہاں دوسروں کو بھی اختلاف کا حق دیتا ہوں۔ رائے کے اختلاف کو رائے کے اختلاف تک محدود رکھتا ہوں اور اسے ذاتی مخالفت یا دشمنی تک آگے نہیں جانے دیتا۔ مجھے اس کوچے میں نصف صدی گزر گئی ہے اور سب دوست جانتے ہیں کہ میں نے اختلاف کا حق استعمال کرنے یا دوسروں کو اختلاف کا حق دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ سادہ سی بات ہے کہ جب میں علمی دنیا کے ہر شخص کو اختلاف کا حق دیتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں تو عمار خان کو اس حق سے صرف اس لیے محروم نہیں کر سکتا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔

عمار خان سلمہ کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ میرے بعض دوستوں اور عزیزوں کو اصل اختلاف میرے کسی طرز عمل سے ہوتا ہے اور نجی محفلوں میں وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن مجھ سے براہ راست اختلاف کرنے یا میرے بارے میں اپنی مخصوص زبان استعمال کرنے کی بجائے وہ یہ نزلہ بھی عمار خان پر گرا دیتے ہیں، اس لیے اسے دوہرے دباؤ کا سامنا رہتا ہے۔

بہر حال عمار خان کی بعض آرا سے دوسرے دوستوں کی طرح مجھے بھی اختلاف ہوتا ہے، لیکن وہ صرف اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح کا اختلاف جیسا اختلاف میں خود والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، قائد محترم حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ سمیت اپنے بہت سے بزرگوں سے کیا کرتا تھا۔ یہ سیاسی مسائل میں بھی ہوتا تھا، علمی معاملات میں بھی ہوتا تھا اور دینی تعبیرات میں بھی ہوتا تھا اور یہ بزرگ اس اختلاف کو سنتے تھے، دلیل کے ساتھ بحث کرتے تھے، جو بات انھیں قبول نہیں ہوتی تھی، اس کے بارے میں کہہ دیتے تھے کہ انھیں اس سے اتفاق نہیں ہے، لیکن انھوں نے کبھی اختلاف کی حوصلہ شکنی نہیں کی، طعن و تشنیع کی زبان استعمال نہیں کی اور اپنا نقطہ نظر مسلط کرنے میں سختی نہیں کی۔ و کفی بھم قدوۃ!

میری سب ناقدین سے گزارش ہے کہ وہ ضرور اختلاف کریں، تنقید کریں اور اپنے موقف کا کھل کر اظہار کریں جس کے لیے ''الشریعہ'' کے صفحات بھی ہمیشہ کی طرح حاضر ہیں، مگر صرف ایک چھوٹی سی درخواست کے ساتھ کہ

اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی*

امام شافعیؒ اور ان کا تجدیدی کارنامہ

[۶، ۷ جنوری ۲۰۱۳ء کو ہندوستان میں فقہ شافعی پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور جامعہ حسینہ شری وردھن کے اشتراک سے منعقد ہونے والے دوروزہ قومی سیمینار میں پیش کیا گیا]

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے جس دین کو پسند کیا اور بندوں کو جس کا مکلّف بنایا ہے، وہ ابدی حقائق پر مشتمل ہے۔ اس کے عقائد و مسلمات کو خلود عطا کیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی وہ بھی زندگی سے بھرا اور حرکت ونشاط سے معمور ہے۔ ''یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا..... اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پرازتغیرات اور پرازانقلابات ہے''۔(۱) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بقول زمان ومکان کی تبدیلیوں سے عہدہ ٔبرآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیم جامع وکامل اور زندہ ہے اور دوسرے اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ رجال کار عطا ہوتے رہے ہیں جو اس کی تجدید کرتے ہیں۔ امام شافعی بھی ایسے ہی رجال اللہ اور مجددین اسلام میں سے ہیں جو اپنے تعلق باللہ، زبان دانی، اخلاص وللّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور خدمت دین میں ممتاز ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں ائمہ اربعہ کا ظہور ایک معجزہ تھا۔ ان میں امام ثالث حضرت امام شافعی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ افقہ الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام دارالہجرت امام مالکؒ کے بعد آئے اور دونوں کے مدرسہائے فکر اور مناہج فقہ کی خوبیوں کے جامع ہوئے۔ انہوں نے دونوں ہی مکاتب فکر سے خوشہ چینی کی۔ ان کے علاوہ انہوں نے تقریباً انیس شیوخ سے علم اخذ کیا جن میں فقیہ الشام امام اوزاعی کے شاگرد عمر بن ابی سلمہ اور فقیہ مصر لیث بن سعد کے شاگرد یحییٰ بن حسان شامل ہیں۔ وہ امام لیث کی فقاہت سے بہت متاثر ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ :اللیث افقه من مالك الاان اصحابه لم یقوموا به :لیث مالک سے بڑے فقیہ ہیں مگر ان کے شاگردوں نے ان کو اٹھایا نہیں۔(۲) شافعی کے شیوخ میں یمنی، کوفی، بصری اور مکی، بغدادی استادوں کے نام بھی آتے ہیں۔ امام مالک کے سامنے تو ان کو بنفس نفیس

*ڈائرکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی۔ ghitreef1@yahoo.com

زانوئے تلمذ طے کرنے کا شرف ملا۔ فقہ حجاز یا مدرسۃ الحدیث سے استفادہ کے بعد وہ عراق گئے جہاں مدرسۂ کوفہ یا مدرسۃ اہل الرائے (۳) کے قریب آئے اور انہوں نے فقہ حنفی کے محرر امام محمدؒ بن الحسن سے کسب فیض کیا۔ یوں وہ حدیث وفقہ دونوں کے جامع بنے اور اپنی شاداب عقل، زرخیز دماغ، بحث واستدلال اور کلام ومنطق کی زبردست اور خداداد صلاحیتوں کے باعث دونوں ہی سابق فقیہوں سے اپنی الگ راہ نکالی اور تیسرے مذہب فقہ کے بانی ومؤسس ہوئے۔

سوانح زندگی: نام محمد، والد کا نام ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع تھا۔ نسبی تعلق قریش کے بنو عبدالمطلب سے تھا۔ عبدمناف میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا نسب مل جاتا ہے۔ فلسطین کے شہر غزہ میں سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ خدا کی شان ہے کہ اسی دن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی وفات ہوئی تھی۔ شافعی کے والد کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا، ان کی پرورش تمام تر والدہ نے کی۔ جب دو سال کے ہوئے تو والدہ محترمہ ان کو لے کر ان کے گھر والوں کے پاس مکہ آ گئیں۔ عسرت، یتیمی وتنگ دستی کے باوجود خاندانی وقار کی حفاظت اور اعلیٰ اخلاق پر تعلیم وتربیت ہوئی۔ امام شافعی کو غیر معمولی ذہانت، جفاکشی، دوراندیشی کے ساتھ ہی غضب کا حافظہ عطا ہوا تھا۔ شعروادب میں بھی طاق ہو گئے کہ مدتوں تک مکہ سے دور صحرا میں بنو ہذیل کے درمیان رہ کر عربی لغت، محاورے اور فصاحت وبلاغت سیکھی تھی۔ ساتھ ہی تیراندازی میں بھی حذاقت تامہ حاصل کر لی۔ بنو ہذیل کے ہاں سے واپس آ کر مکہ کے علماء کے پاس قرآن حفظ کیا اور حدیث وفتویٰ کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے استاد مسلم بن خالد زنجی نے ان کی قابلیت کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا: اے ابوعبداللہ، اب تم فتوی دو، کیونکہ فتوی دینے کے اہل ہو چکے ہو''۔ (۴) مگر شافعی کو مزید علم کا شوق تھا چنانچہ انہوں نے امام مالکؒ کے درس حدیث اور ان کی کتاب مؤطا کا شہرہ سنا تو مدینہ کی راہ لی۔ والیٔ مکہ نے ان کے لیے ایک سفارشی خط امام مالکؒ کی خدمت میں لکھ دیا۔ مگر مالک کی خدمت میں حاضری دینے سے پہلے ہی مکہ کے کسی عالم سے مؤطا لے کر پوری پڑھ لی بلکہ حفظ کر لی۔ اس کے بعد مدینہ حضرت امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے جس کا حال یوں لکھا ہے: ''میں صبح سویرے امام مالک کی خدمت میں پہنچ گیا اور مؤطا زبانی پڑھنی شروع کر دی حالانکہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ امام صاحب سننے لگے۔ جب مجھے خیال آیا کہ امام مالک تھک گئے ہوں گے تو میں نے قرأت روکنی چاہی، مگر حضرت امام کو میری قرأتِ مؤطا اتنی پسند آئی تھی کہ انہوں نے فرمایا: اے نوجوان اور پڑھ، چنانچہ یوں میں نے چند دنوں میں پوری مؤطا ان کو سنائی اور ختم کر لی۔'' (۵) اس کے بعد شافعی فقہ وحدیث میں امام مالک سے مستفید ہونے لگے یہاں تک کہ اصحابِ مالک میں شمار ہونے لگے اور ان کی وفات (۱۷۹ھ) تک ان کے سرچشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے۔

پھر یمن کے گورنر شافعی کو اپنے ساتھ لے گئے اور علاقۂ نجران کا قاضی مقرر کر دیا جہاں آپ پوری جرأت، عدل وانصاف اور خوفِ خدا کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگے، تاہم اس گورنر کے بعض عمال ومقربین کی زیادتیوں پر کھلی اور شدید تنقید نے اس کو آپ سے ناراض کر دیا۔ اس نے آپ سے یوں انتقام لیا کہ خلیفہ کی خدمت میں آپ کی شکایت لکھ بھیجی کہ یہاں کئی علوی لوگ ہیں اور ایک قریشی نوجوان ان کا حمایتی ہے۔ یہ لوگ خلافت پر خروج کا ارادہ رکھتے ہیں اور میرے قابو میں نہیں آ رہے۔ خلیفہ عباسی ہارون الرشید نے ان سب لوگوں کو اپنے دربار بغداد بلا بھیجا۔

امام شافعی علویوں سے محبت رکھتے تھے، مگران پر بغاوت کا الزام بالکل غلط تھا۔ بہرحال اپنی باری آنے پر انہوں نے اپنی طلاقت لسانی اور زور بیان کے بل پر اپنے کیس کی وکالت کی اور خلیفہ کے قاضی امام محمدؒ بن الحسن تلمیذ رشید ابوحنیفہؒ کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے۔ یہیں سے وہ امام محمدؒ کے رابطہ میں آئے اور انہوں نے امام محمد کے علم وتفقہ سے فیض اٹھایا، ان سے مذاکرے کیے اور عراقی مکتب فکر اور اس کے منہج سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔

یہاں سے فارغ ہوکر شافعی مکہ گئے جہاں انہوں نے حرم مکی میں نو سال تک درس دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے مکہ ہی میں ان کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے اور جب ۱۹۵ھ میں شافعی دوبارہ بغداد آئے تو امام احمد نے ان کا بڑا اکرام کیا۔ بغداد کے اس سفر میں انہوں نے فقہ مالک اور فقہ حنفی سے الگ اپنی فقہی رایوں کا اظہار شروع کیا اور بغداد کے علماء وفقہاء سے ان کے مذاکرے ہوئے۔ بغداد میں انہوں نے جو فتوے دیے، انہی کو فقہ شافعی میں قول قدیم کہا جاتا ہے۔

مصر بھی اس وقت اہل علم کا مرکز تھا جہاں امام مالک کے بہت سے تلامذہ استاد کی فقہ کو عام کر رہے تھے۔ مصر ہی میں امام لیث بن سعد تھے جن سے شافعی کی مراسلت ہوئی تھی۔ ۱۹۹ھ میں شافعی مصر گئے جہاں انہوں نے اپنا مذہب فقہی باقاعدہ قائم کیا۔ وہاں ان کو بہت سے تلامذہ میسر آئے۔ مصر میں انہوں نے اپنے بہت سے خیالات کی تنقیح کی اور بہت سی سابق رایوں سے رجوع کیا اور نئی رائے پر فتوے دیے جن کو قول جدید کہا جاتا ہے۔ ۲۰۴ھ میں مصر میں ہی شافعی کی وفات بھی ہوئی جس کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں۔ (۶) ان کے تلامذہ بویطی، سلیمان بن الربیع وغیرہ نے مصر میں ان کے مسائل وفتاوی کو مدون کیا اور یہیں سے شافعی مسلک کی عالم اسلام کے مختلف خطوں میں اشاعت ہوئی۔

امام شافعیؒ اور ان کی فقہ کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے حدیث وفقہ کو جمع کیا ہے اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ فقہ شافعی میں اصح مافی الباب (یعنی کسی مسئلہ کے سلسلے میں سب سے صحیح حدیث) سے اخذ واستفادہ کا رجحان ہے۔ شافعی کا بہت بڑا اور تجدیدی کارنامہ اور مجموعی طور پر اسلامی فقہ پر ان کا زبردست احسان ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی کے اصول مدون کیے، فروعی مسائل اور جزئیات کو منضبط کرنے والے جامع قواعد وکلیات کا استنباط کیا اور اپنی 'الرسالہ' اور 'الام' کے ذریعہ علم وفکر کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔ کتاب وسنت کے نصوص سے شرعی مسائل کا استنباط اپنی جگہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ تاہم اس مسائل کی اصول سازی اور نظریہ سازی اس سے بھی بڑا کام ہے اور یہ شافعی کی عبقریت ہے کہ انہوں نے دونوں کام کیے اور اس راہ میں طریق معتدل کی دریافت کی۔ مثال کے طور پر اپنے بہت سے معاصرین کی افراط وتفریط کے درمیان انہوں نے کہا کہ قرآن اصل شرع ہے (۷) شافعی کے لفظوں میں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو کچھ بھی اپنی رحمت کے طور پر اور بندوں پر حجت کے لیے نازل فرمایا، اس کا عالم عالم ہے اور جو اس کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے۔ اس کو نہ جاننے والے کو عالم نہیں کہہ سکتے اور اس کے جاننے والے کو جاہل نہیں کہہ سکتے۔ اور علم کے اندر لوگوں کے درجات مختلف ہیں۔ اور جتنا کوئی قرآن کا علم رکھتا ہے اتنا ہی اس کا رتبہ سوا ہے اس لیے طالبانِ علم پر لازم ہے کہ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی بھرپور جدوجہد کریں اور اس راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے اس کو برداشت کریں اور نص یا استنباط سے قرآن کے علم کے حصول میں نیت خالص اللہ کے لیے رکھیں۔''

یعنی قرآن شافعی کے نزدیک بیانِ کلی ہے اور سنت اس کی تبیین۔(۸) صحابہ بھی اسی کے قائل تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: من جمع القرآن فقد حمل امرا عظیما و لقد ادرجت النبوۃ بین جنبیہ الا انہ لا یوحی الیہ: جس کے پاس قرآن کا علم ہے تو وہ ایک امر عظیم کا حامل ہے، گویا کہ اس کے سینہ میں نبوت دے دی گئی ہے، اگر چہ اس کے پاس وحی نہیں آتی۔(۹) ابن حزمؒ اس بنیاد پر کہتے ہیں کہ: کل ابواب الفقہ لیس منھا باب الا ولہ اصل فی الکتاب، والسنۃ تعلنہ۔ فقہ کا کوئی باب ایسا نہیں جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو، سنت اس کی تفصیل سے وضاحت کرتی ہے۔ اس کے بعد شافعیؒ نے بیانِ قرآن کی دو قسمیں کی ہیں:

۱۔ وہ آیات جو خود اپنی شرح ہیں اور جن کو مزید تفسیر کی ضرورت نہیں، مثلاً صوم اور لعان کا بیان۔

۲۔ قرآن کی دوسری قسم وہ ہے جس کو انہوں نے القسم الذی من القرآن لا یکون نص فی الموضوع بل البیان فیہ یحتاج الی السنۃ کہا ہے یعنی وہ قسم جو موضوع پر خود دلالت نہ کرے بلکہ اس کے بیان کے لیے سنت کی ضرورت پڑے۔(۱۰)

اسی طرح یہ مسئلہ ہے کہ قرآن کے فرائض وواجبات کے بارے میں صحیح نقطۂ اعتدال کیا ہے؟ شافعی نے قرآن کے متعدد نصوص میں غور وفکر کر کے فرض کو دو وجوہ پر تقسیم کیا ہے: فرض عین اور فرض کفایہ۔ وہ فرض کفایہ کو المطلوب علیٰ وجہ الکفایۃ یراد بہ العام ویدخلہ الخصوص (ایسا عام فرض جو کچھ لوگوں سے مطلوب ہو) سے تعبیر کرتے ہیں۔(۱۱) امام شاطبی نے اس کی بے حد معنی خیز تفصیل کی ہے اور اس کو فرض عین پر ایک گونہ فوقیت دی ہے۔ ابوزہرہ کی کتاب میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ چونکہ امام شافعی نے خود اصول وقواعد کا استخراج کیا اور ان کی تدوین کی، اس لیے بقول ابوزہرہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے لوگوں کو مذہب شافعی پر تخریج (کسی اصل سے مزید مسئلہ نکالنا) کے لیے اصول ثابتہ مقررہ میسر آ گئے، جبکہ یہ چیز دوسرے مذاہبِ فقہ میں نہیں پائی جاتی کیونکہ شافعی کے علاوہ کسی اور امام سے یہ منقول نہیں کہ انہوں نے شافعی کی طرح قواعد بیان فرمائے ہوں۔(۱۲)

امام شافعی کا دوسرا کارنامہ حجیت حدیث کا اثبات ہے۔ موجودہ زمانہ میں انکار حدیث کا جو فتنہ پیدا ہوا ہے، عموماً اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا ظاہرہ Phenamenon ہے، مگر امام صاحب کی دونوں کتابوں الرسالہ اور الام کے ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ فتنہ نہایت قدیم ہے۔ شافعی کے زمانہ میں تین طرح کے منکرین حدیث موجود تھے جن سے ان کی گفتگوئیں بھی ہوئیں اور جن کی آرا کو اپنی تحریروں میں نقل کر کے انہوں نے ان پر تفصیل سے محاکمہ بھی فرمایا ہے۔ الام کی کتاب جماع العلم میں شافعی نے تفصیل سے منکرین سنت کے بارے میں بیان کیا ہے۔ (الرسالہ میں حجیت حدیث کا اثبات ہے اور الام میں منکرین سے مناظرہ اور ان کے استدلال کا تفصیلی رد ہے۔) شافعیؒ کے مطابق حدیث کا انکار کرنے والے فی الجملہ تین طرح کے لوگ ہیں:

پہلے تو وہ لوگ ہیں جو بالکل ہی سنت کا انکار کرتے ہیں۔ الرسالہ میں امام صاحب نے ان لوگوں کا پورا استدلال نقل کر کے ان کو جواب دیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ: و جملۃ قبولھم

واحتجاجهم له ان الکتاب فیه تبیان لکل شیئی ،وان الکتاب عربی ،لایحتاج الی بیان غیرمعرفة اللسان العربی والاسلوب العربی الذی جاء القرآن به ،ولیس وراء بیانه بیان (۱۳) ای السنة لایمکن ان تاتی بشرع زائدعلی مافی الکتاب الله (ابوزہرۃ) مطلب یہ ہے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے اور عربی کلام کو سمجھنے کے لیے عربی اور زبان اور عربی اسلوب کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت کیوں پڑنے لگی۔اسی سنت قرآن کے کسی حکم پر اضافہ بھی نہیں کرسکتی۔ان کے استدلال کا جواب امام شافعی نے بہت تفصیل سے دیا ہے جس کی تلخیص ابوزہرہ نے کردی ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو صرف انہیں حدیثوں کو لیتے ہیں جن کے مطابق قرآن میں کوئی حکم پایا جاتا ہے۔یہ خبر واحد کو قبول نہیں کرتے۔(ماکان فیه قرآن یقبل فیه الخبر) اور تیسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جو بس انہی احادیث کو مانتے ہیں جو متواتر و مستفیض ہیں اور خبر واحد کی حجیت کے قائل نہیں ہے۔(وثالث المذاهب المخالفة للجماعة مذهب الذین ینکرون حجیة خبرالآحاد جملة ولایعتبرون الا الاخبارالمتواترة المستفیضه (۱۴) پہلا گروہ تو امت سے بالکل ہی خارج ہے(وقائل ذلك لیس من الاسلام فی شیء) (۱۵) اور دوسرے گروپ کے بارے میں تفصیل ہے کہ ان کے قول کے دو مطلب نکلتے ہیں: ایک لحاظ سے یہ بھی پہلے ہی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا انہیں میں سے شمار ہوں گے اور اگر ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں تعارض نہیں ہوسکتا تو یہ بات درست ہے اور اس لحاظ سے اگر یہ خبر واحد میں شک کرتے ہیں تو ان کو خارج عن الامۃ (امت سے باہر) نہیں سمجھا جائے گا۔

پہلے گروپ کو امام صاحب زنادقہ، خوارج اور بعض معتزلہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جنہوں نے اپنی تائید میں ایک حدیث بھی گڑھ لی تھی کہ: جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اس کو کتاب اللہ پر پیش کرو۔اس کے موافق ہو تو سمجھو کہ وہ میرا ہی قول ہے اور اس کے خلاف ہو تو سمجھو کہ وہ میرا قول نہیں ہے کہ قرآن مجھ ہی پر اترا ہے، اسی سے اللہ نے مجھے ہدایت دی تو میرا قول اس کے خلاف کیسے ہوگا۔(مااتاکم منی فاعرضوه علی کتاب الله، فان وافق کتاب الله فانا قلته وان خالف کتاب الله فلم اقله، وکیف اخالف کتاب الله وبه هدانی الله)۔اس حدیث کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن بن مہدی نے فرمایا کہ اس کو زنادقہ اور خوارج نے گھڑا ہے۔(۱۶)

آج کے منکرین حدیث بھی کم وبیش انہی خیالات کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ان کے استدلال بھی تقریباً یہی رنگ لیے ہوتے ہیں۔امام شافعی ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے تھے جب روایات کی کثرت تھی، واضعین حدیث اور منکرین سنت کی مذموم کوششوں سے اہل علم کے لیے سنت کے حوالہ سے ایک بڑا علمی چیلنج پیدا کردیا تھا۔وضعی حدیثوں کا ایک سیلاب تھا، ایسے میں شافعی جیسے عبقری نے وقت کے اس چیلنج کا جواب دیا۔آپؒ نے واضح کیا کہ سنت صحیحہ ثابتہ قرآن سے باہر نہیں ہے، وہ قرآن ہی مستنبط ہے۔اس کی اصل قرآن میں موجود ہے اور سنت اس کی مستند ترین شرح وتفسیر ہے۔اسی کتاب میں آپ نے ثابت کیا کہ قرآن میں کئی جگہ الکتاب والحکمۃ ساتھ ساتھ آیا ہے۔(مثلاً البقرہ:۱۲۹) جس میں کتاب سے

مراد قرآن اور حکمت سے مراد اس کی نبوی تفسیر (حدیث) ہے (الکتاب ھو القرآن والحکمۃ ھی السنۃ النبویۃ (۱۷) ظاہر ہے کہ حکمت منزل من اللہ وحی اور اسوۂ نبوی کا عمل کی دنیا میں کامل ترین اظہار ہے، یہ وہ دانش نورانی ہے جس کو وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (النجم:۳،۴) کی تائید ربانی حاصل ہے۔ الرسالہ میں انہوں نے تینوں فریقوں کے جواب دیے ہیں اور اسی وجہ سے مکہ، بغداد اور مصر وغیرہ میں شافعی کو ناصر السنۃ اور حافظ حدیث کہا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ شافعی بغیر کسی تعصب کے حق کی حمایت کرتے تھے۔

امام شافعی سے پہلے اہل الرائے، اصحاب الحدیث پر اپنے منطقی طرز استدلال کے ذریعہ غالب آجایا کرتے جبکہ اصحاب الحدیث ذخیرۂ آثار و روایات میں ان کو دبا لیتے تھے۔ جب شافعی آئے تو وہ ان دونوں ہی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ چنانچہ ان سے دونوں مدرسہائے فکر کے جس آدمی نے بھی بحث مباحثہ کیا، کوئی بھی شافعی کے سامنے نہ ٹک سکا۔ حق کے سلسلے میں بلا خوف لومۃ لائم امام شافعی نے اپنی آرا کا اظہار کیا۔ چنانچہ امام مالک سے محبت کے باوجود انہوں نے ''خلاف مالک'' لکھی جس میں اپنے استاذ کی بہت سی رایوں پر تنقید تھی۔ اسی طرح اپنے دوسرے استاد امام محمد سے بھی مناقشہ کیا اور بصرہ کے علماء سے مناظرہ کیا اور سب میں غالب رہے۔ مگر برا ہو مسلکی تعصب کا کہ جب امام صاحب مصر گئے تو وہاں کے مالکیوں نے ''خلاف مالک'' لکھنے کی وجہ سے والی مصر سے ان کی شکایت کی اور ان کو مصر سے نکلوا دینے کی کوشش کی!! حالانکہ ان کا اختلاف صرف مالک سے ہی نہ تھا بلکہ حنفیہ اور دوسرے ائمہ فقہ سے بھی تھا۔ مثال کے طور پر امام شافعی خبر واحد کو اہمیت دیتے ہیں اور قرآن کے عام کی تخصیص خبر واحد سے جائز قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں حنفیہ کا ان سے اختلاف ہے کیونکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ قرآن قطعی الثبوت ہے اور خبر واحد ظنی الثبوت، اس لیے ظنی سے قطعی کی تخصیص نہیں ہو سکتی (۱۸) سوائے اس صورت کے کہ اس عام کی پہلے ہی کسی اور سے تخصیص ہو چکی ہو۔

واضح رہے کہ ابو زہرہ کی تحقیق میں شافعی خود عقیدہ کے اثبات میں خبر واحد کو کافی نہیں سمجھتے۔ انہوں نے خبر واحد کی حجیت تو ثابت کی ہے تاہم وہ خبر واحد کو، جیسا کہ ابو زہرہ لکھتے ہیں، قرآن کے یا خبر متواتر و مستفیض کے درجہ میں نہیں رکھتے اور ابو زہرہ کے لفظوں میں: بھذا تراہ یضع الامور فی مواضعھا فھو یجعل الآحاد حجۃ فی العمل دون الاعتقاد، فیقرر ان الشك فیه لاعقاب علیه (۱۹) اس کے بعد امام صاحب نے خبر الواحد (روایات الخاصۃ) کے قبول کے دقیق شرائط بیان کیے ہیں اور یہ سب شرطیں وہی ہیں جن کو ماہرین مصطلح الحدیث نے قبول کیا اور ان سے اتفاق کیا ہے۔ خبر واحد کے علاوہ امام شافعی نے مرسل کو بھی بعض کڑی شرائط کے ساتھ قبول کیا ہے، مثلاً یہ کہ مرسل کبار تابعین کی ہو، اس مرسل کی کسی اور متصل روایت سے تائید ہوتی ہو یا قول صحابی اس کے مطابق ہو وغیرہ۔

اسوۂ متواترہ مکشوفہ و مروجہ کا سب سے بڑا اظہار امام مالک کے نزدیک عمل اہل مدینہ ہے، لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ اور خصوصاً حضرت عمر بن الخطابؓ کے بعد اجلہ صحابہ کی بڑی تعداد جہاد، نشر علم اور دعوتی مقاصد کے تحت مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئی تھی اور مدینہ کا علمی اختصاص بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا اور اس حقیقت کو خود امام مالک بھی تسلیم کرتے تھے۔ جبھی تو انہوں نے خلیفہ منصور کو اس بات سے روک دیا تھا کہ مؤطا کو پورے عالم اسلام کا دستور العمل

بنا دیا جائے۔ انہوں نے خلیفہ کو خود یہی دلیل دی تھی کہ صحابہؓ کے علم کے حامل مختلف بلاد میں پھیل گئے ہیں اور وہاں لوگ ان کے فتووں پر عمل کر رہے ہیں، اگر ان کو ایک ہی مدرسۂ فکر کا تابع بنا دیا جائے گا تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے امام شافعی نے جو استدلال کیا اس کا مفاد یہ ہے کہ سنت قولی جو متعدد اہل علم صحابہ جیسے ابو ہریرہؓ، عائشہؓ اور ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے، اس کو عمل اہل مدینہ پر ترجیح ہوگی۔ الرسالہ میں شافعی نے اصولی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ قولی حدیثوں سے مروجہ سنت (مدینہ میں) کی تصحیح وتنقید کا کام لیا جائے گا۔ الرسالہ جو اصول حدیث، فقہ اور اسلام کی مذہبی تاریخ پر اولین تصنیف ہے، اس نے آنے والے دنوں میں فکر اسلامی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ہمارے زمانہ میں کچھ لوگ بڑی شدت سے تقلید کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں حالانکہ جس تقلید جامد کی مخالفت کا ان کو دعویٰ ہے، اس کا رستہ تو خود ائمہ متبوعین نے خود ہی بند کر دیا ہے۔ چنانچہ ہر امام تقلید جامد کے بالکل خلاف تھا اور سبھی حریت فکر کے قائل تھے۔ امام شافعی کا بھی اس کلیہ سے کوئی استثنا نہیں۔ جس طرح انہوں نے دلائل کے ساتھ اپنے اساتذہ اور معاصرین سے اختلاف فرمایا، اپنے شاگردوں کو بھی اسی کی تربیت دی کہ وہ ان کی جامد تقلید نہ کریں، چنانچہ شافعی نے فرمایا: اذا صح الحدیث فھو مذھبی و اضربو ابقولی عرض الحائط (جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور اس کے ہوتے ہوئے میرے قول کو دیوار پر مار دینا)۔ تمام ائمہ سے اسی طرح کے اقوال منقول ہیں اور امام ابوحنیفہ کے اسکول کا تو یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنے تلامذہ کو زبردست حریت فکری عطا کی تھی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ان کے ارشد تلامذہ نے امام ابوحنیفہ کی دو تہائی آرا سے اختلاف کیا ہے۔ (۲۰) یہی آزادیٔ رائے امام شافعی کے ہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ ہے کہ اگر شافعی کے قول کے خلاف کوئی حدیث مل جاتی ہے اور ان کے قول کو چھوڑ کر حدیث کو اختیار کر لیا جاتا ہے تو یہ مذہب سے خروج شمار نہیں ہوتا۔ بس شرط یہ ہے کہ جو لوگ مذہب امام سے باہر جائیں، وہ رتبۂ اجتہاد کو پہنچ گئے ہوں۔ (۲۱) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب شافعی میں تخریجات کرنے والے علماء دو طرح کے تھے۔ وہ مخرّج جو اصول شافعی سے باہر نہیں نکلتے جیسے شیخ ابو حامد اور قفال۔ دوسرے وہ مخرّج جو مذہب شافعی سے اصول وفروع دونوں میں باہر چلے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ خود اجتہاد مطلق کے درجہ پر فائز ہیں۔ مثال کے طور محمدّون (محمد نام کے علماء) جن سے مراد ہیں: محمد بن نصر، محمد بن جریر طبری، محمد بن خزیمہ اور محمد بن المنذر، لیکن چونکہ انہوں نے کسی الگ فقہی مکتب فکر کی بنیاد نہیں ڈالی اور شافعی ہی رہے، اس لیے ان کو بھی شافعی مذہب کے اندر ہی شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ بعض کی رائے میں ان کے تفردات کو شافعی مسلک سے باہر سمجھا جائے گا۔ (۲۲)

اسی طرح اسلامی فکر میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے اصول اربعہ کو بھی امام شافعی نے الرسالہ میں مضبوط استدلالی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔ تاہم ان کی تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اجماع سے مراد ان کی صحابہ کا اجماع ہے اور اس کے بعد کا اجماع ان کے نزدیک ثابت نہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اگر صحابہ کسی امر پر متفق ہوں تو وہ تمام فقہاء کے نزدیک اجماع ہے اور اس پر عمل واجب۔ اس میں فقہاء اور اہل الحدیث کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے

بعد اگر اہل مدینہ کا کسی امر پر اجماع ہے تو اس کو امام مالک ایک دلیل شرعی مانتے ہیں اور اس کی مخالف صحیح حدیث کو رد کر دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ کے خلاف ہونا حدیث میں قادح ہے۔ امام شافعی کے زمانہ میں صورت حال یہ تھی کہ ہر فریق اپنی رائے پر اجماع کا دعویٰ کر رہا تھا۔ ایسے میں شافعی نے اصولی طور پر اجماع کو شرعی حجت تسلیم کیا۔ کتاب وسنت میں اس کی بنیاد دریافت کی، اس کے مبادی منضبط کیے۔ تاہم عملی سطح پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے، کیونکہ ہمارے پاس اجماع کے عملاً وقوع کی کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اجماع کا مرتبہ کتاب وسنت کے بعد ہوگا اور وہ ان کے تابع ہوگا۔ اس معاملہ میں فریق مخالف کی انہوں نے شدت سے مخالفت کرتے ہوئے یہاں تک کہ دیا کہ: دعوی الاجماع خلاف الاجماع (اجماع کا دعوی کرنا خود اجماع کے خلاف ہے) اور آگے اس کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: اجماع کے عیب کے لیے تو یہی کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں کی زبانوں پر تمہارے اس زمانہ کے علاوہ کبھی اس کا نام نہیں آیا۔ (۲۳) یوں شافعی بعض اجماع کے قائل ہیں، من کل الوجوہ اس کا انکار نہیں کرتے۔

اجماع کے علاوہ رائے، قیاس (یا اجتہاد) کو انہوں نے منضبط کیا ہے مگر استحسان پر تنقید کی ہے جس کا اعتبار مالکیہ وحنفیہ دونوں کے ہاں ہوتا ہے۔ کتاب الام میں اس کے رد میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ قیاس یا رائے (اجتہاد) ایک اصولی فریم ورک کے اندر operate کرتا ہے، اس لیے وہ درست ہے، جبکہ استحسان کو کسی کلیہ کے تحت لانا دشوار ہوتا ہے، اس لیے استحسان کو دلیل شرعی نہیں سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے اپنے استاد امام محمد سے اختلاف کیا ہے جس طرح عمل اہل مدینہ کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے دوسرے استاد وشیخ مالک سے بھی اختلاف کیا تھا۔ تاہم قیاس کو شافعی اجماع کی نگرانی میں دینے کے حامی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ نئی تعبیری اور فکری کوششوں کو فکر اسلامی کے محور کے گرد رکھا جائے۔

واضح رہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مذاہب اربعہ بنیادی طور دو مذاہب یعنی فقہ شافعی اور حنفی کے اندر ضم ہو جاتے ہیں اور انہوں نے التفہیمات الالٰہیہ میں کہا ہے کہ میرا طریقہ جہاں تک ممکن ہے ان دونوں مذاہب کے درمیان جمع وتطبیق کرنا ہے۔ فرماتے ہیں: ونحن ناخذ من الفروع ماتفق عليه العلماء ولاسيما هاتان الفرقتان العظيمتان الحنفية والشافعية وخصوصاً في الطهارة والصلاة فأن لم يتيسر الاتفاق واختلفوا فنا خذ بمايشهد له ظاهرالحديث ومعروفه ونحن لانزدرى احداً من العلماء فالكل طالب الحق ولا نعقدالعصمة في احدغير النبيى صلى الله عليه وسلم (۲۴)

''فروع میں ہم علما کے متفق علیہ مسئلہ کو لیتے ہیں خاص کر حنفی وشافعی مسلک کے اتفاق کو کہ یہ عظیم فرقے ہیں اور وہ بھی طہارت ونماز کے سلسلہ میں خصوصاً۔ اگر اتفاق نہ حاصل ہو اور علما مختلف ہوں تو پھر جس مسئلہ کی تائید ظاہر حدیث سے ہوتی ہے، ہم اسے اختیار کرتے ہیں۔ ہم علما میں سے کسی کی بھی اہانت نہیں کرتے کہ سبھی حق کے طالب ہیں، البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کے لیے عصمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔''

امام شافعی پر نئے نئے مطالعات جاری ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی نے اس کا اظہار کیا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک ''نص شرعی'' صرف اور صرف قرآن کو کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی اور چیز اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے الام کے بہت سے اقتباسات اور فقرے نقل کر کے اس تحقیق کو پیش کیا ہے۔ البتہ یہ وضاحت کر دی ہے کہ صحیح اور ثابت سنت بہر حال اس کی شرح و تفسیر ہے۔ (۲۵)

امام شافعی کا ظہور عصر عباسی کے دوسرے مرحلہ میں ہوا جب مختلف اسلامی علوم وفنون کی تدوین زور وشور سے ہو رہی تھی۔ علم کلام اور متکلمین میدان میں تھے۔ یونانی، سنسکرت، فارسی اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی تحریک برگ وبار لا رہی تھی۔ مسلمانوں میں بھی طرح طرح کے فقہی، کلامی اور شیعہ فرقے وجود پذیر تھے۔ فقہ حنفی و مالکی کی نشو ونما ہو رہی تھی۔ اس عہد میں انہوں نے آنکھ کھولی اور اپنے عہد کے ان سبھی حالات، وقائع اور چیلنجوں سے واقفیت حاصل کی۔ امام صاحب قوی الحجت، زبان آور، فصیح وبلیغ، اور استدلالی انداز و منطقی اسلوب تکلم کے مالک تھے۔ چنانچہ اپنی کتابوں الرسالہ اور الام وغیرہ میں انہوں نے جو مقدمات قائم کیے، اور جس انداز میں فقہ، فقہ حدیث اور اصول فقہ کے سلسلہ میں اپنے استدلالات کی بنیاد رکھی اور جو نتائج نکالے، ان سے ایک زمانے نے اتفاق کیا۔ امام مالک نے مؤطا کے ذریعہ حدیث، اقوال صحابہؓ اور علماء مدینہ کی رایوں (عمل اہل مدینہ) اور اپنے فتاویٰ کو جمع کر دیا تھا۔ شافعی مؤطا سے بہت متاثر تھے اور سب سے پہلے اس کو انہوں نے ہی اصح کتاب بعد کتاب اللہ کا معزز نام دیا تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نئے نئے مسائل کے حل کے سلسلہ میں اجتماعی اجتہاد، بحث ومناقشہ کے بعد مسائل کے استنباط واستخراج کی عظیم نظیر قائم کر چکے تھے۔ ان دونوں اماموں کے بعد ان دونوں کے علمی فکری اور فقہی سرمایہ سے کام لے کر امام شافعی نے اصول فقہ کی تدوین کی اور ادلہ شرعیہ سے اخذ واستنباط کا ایک واضح منہاج قائم کر دیا جس کے لیے قیامت تک امت ان کے زیر بار احسان رہے گی۔

مراجع وحواشی

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ اول، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ 1992، صفحہ 18

(۲) الامام محمد ابوزہرہ، الشافعی حیاتہ وعصرہ فقہہ وآراءہ طبع ثانی دار الفکر العربی 1978، ص 47)

(۳) اہل الرائے اور اہل الحدیث محض تغلیبا ہے۔ رائے سے مراد ہے کہ قرآن وحدیث میں اگر کسی مسئلہ میں صریح حکم نہیں مل رہا ہے تو اجتہاد کیا جائے، جیسا کہ فقہاء عراق کرتے تھے، مگر ایسی صورت حال میں فقہاء حجاز اجتہاد کا رجحان کم رکھتے تھے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ مدرسۃ اہل الرائے یعنی مدرسۂ کوفہ حدیث کو چھوڑ کر رائے پر عمل کرتا تھا اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ مدرسۃ اہل الحدیث (مدینۃ) میں رائے اور تفقہ سے کام ہی نہیں لیا جاتا تھا۔ فرق صرف کم وبیش کا ہے اور ان دونوں ہی رجحانوں کی دلیل اسوۂ نبوی میں ملتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل الرائے اور اہل الحدیث کا استعمال تغلیبا ہوتا ہے اور دو مختلف مناہج فکر کو بتانے کے لیے ہوتا ہے۔ اور یہاں اہل الحدیث سے مراد ہمارے زمانہ کا فرقہ اہل حدیث تو ہرگز مراد نہیں ہے، جس پر ظاہریت کی چھاپ اور آج کل ائمہ فقہ اور خاص کر فقہ حنفی سے عداوت کا غلبہ ہے۔

(۴) الامام محمد ابوزہرہ، الشافعی حیاتہ وعصرہ فقہہ وآراءہ طبع ثانی دار الفکر العربی 1978 اور اجتباء ندوی، تاریخ فکر اسلامی،

المرکزالعلمی نئی دہلی 1998)

(۵)حوالہ سابق،اوراجتباءندوی،تاریخ فکراسلامی،المرکزالعلمی نئی دہلی 1998)

(۶)(۶)مشہورقول کے مطابق بواسیر کے مرض سے بعمر 54سال امام شافعی کی وفات ہوئی اورمعجم یاقوت کی روایت کے مطابق کسی فتیان نامی متعصب مالکی سے ان کا مناظرہ ہوا جس میں شافعی نے اس کولا جواب کردیا۔اس نے امام صاحب سے بدسلوکی کی،جس کی شکایت کسی نے والی مصر سے کردی،جس پراس نے فتیان کوسزادلوائی۔جذبہ انتقام میں اس کے ساتھی امام صاحب کے حلقہ میں پہنچ گئے اورجب آپ کے سب تلامذہ اوراصحاب چلے گئے تو آپ پرحملہ کردیا۔ان کے زدوکوب کرنے سے آپ زخمی ہوگئے جن کی تاب نہ لاکر چنددن بعدانتقال فرماگئے۔الامام محمدابوزہرہ،الشافعی32)

(۷)ایضا211)

(۸)ایضا211)

(۹)ایضا ،210)

(۱۰)ایضا214)

۱۱۔202

12۔379)

13۔218

14۔220)

15۔219)

16۔(دیکھیں ابوزہرہ:الامام الشافعی:صفحہ 219)

17۔(222)

18۔ (208)

19۔ (232)

20۔امام محمدؒامام ابوحنیفہؒ کے شاگردہیں اورفقہ حنفی کے اساطین میں سے ہیں مگراپنے استاذ سے نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی سینکڑوں مسائل میں اختلاف کیا۔سبکیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:فانهمايخالفان اصول صاحبهما، طبقات الشافعیہ 1/243 امام الحرمین الجوینیؒ کہتے ہیں کہ ان دونوں نے مسلک حنفی کے 2/3 حصہ میں امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا اور امام شافعی کاقول اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:صلاح الدین مقبول احمد،زوابع فی وجه السنة قديماوحديثا،مجمع البحوث الاسلاميه ،الطبعة الاولى 1411ھ 1991 جوگابائی 1/8 نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ صفحہ ۴۲۲

21۔(دیکھیں ابوزہرہ:الامام الشافعی،383)

22۔ صفحہ 382)

23۔(87)

24۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،(تفهيمات ۲/ ۲٤۲ اکادمية الشاه ولى الله دهلوى باكستان)۔

25۔ ملاحظہ ہو کتاب:مفاہیم محوریہ فی المنہج والمنہجیہ دوسراباب مفہوم النص دارالسلام،القاہرہ،الطبعۃ الاولی،2009)

احمد جاوید*

مسلم نشاۃ ثانیہ: اصلاحِ مفاہیم

۱۔ اس بات کا شعور بہت ضروری ہے کہ نشاۃ الثانیہ کی اصطلاح مسلمانوں کے لیے وہ معانی نہیں رکھتی جو یورپ کی تحریک نشاۃ الثانیہ کی بنیاد بنا تھا۔ مغرب میں نشاۃ الثانیہ کے تمام نتائج دین کے مخالف رخ پر نکلے اور اس تحریک میں ایک رَو اسلام دشمنی کی بھی تھی۔ ایک تہذیبی تناظر میں یورپ نشاۃ الثانیہ میں اسلام دشمنی کے کسی عنصر کی موجودگی ہمارے لیے کوئی بڑا انتباہ نہیں ہے، بشرطیکہ وہ تحریک عیسائیت کے کسی مذہبی تصور کے دفاع اور اس کی تشکیل وتجدید کے لیے اٹھتی، لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس تحریک نے عیسائیت کے مذہبی جوہر کو منہا کر کے یونانی انداز تعقل کو نئے سرے سے اختیار کیا اور اس فلسفیانہ عقل پرستی کو مذہبی مابعد الطبیعی مباحث اور حقائق کی شناخت کا واحد مستند ذریعہ قرار دے دیا۔ اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا اور اس تحریک کو جس مقصد کا حصول درکار تھا، وہ مقصد بھی حاصل ہو گیا یعنی دین اور دنیا کی جدائی۔ جدید مغرب اسی تحریک کے شجر کا پھل ہے۔ مسلم نشاۃ الثانیہ، ظاہر ہے کہ ان محرکات اور نتائج کو کسی ادنیٰ درجے میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔

۲۔ رہا یہ سوال کہ مسلم نشاۃ الثانیہ کے تصور کا حقیقی سیاق وسباق کیا ہے تو اس معاملے میں ہمیں بہت احتیاط اور تفکر کے ساتھ اپنے وسائل اور مقاصد متعین کرنے پڑیں گے۔ سردست یہ ایک سیاسی تصور بن گیا ہے اور اس میں رومانویت کی آمیزش زیادہ ہے۔ نشاۃ الثانیہ کا مروجہ تصور، جس سے ہم بہت زیادہ مانوس ہو چکے ہیں، یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اقوام عالم پر اپنی بالادستی، نظام زندگی کے ہر شعبے میں نہ صرف یہ کہ ثابت کر دے بلکہ ماضی میں جس طرح یہ حاصل تھی، اسے پھر سے قائم کر کے دکھا دے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلم نشاۃ ثانیہ کا تصور رکھنے والے تمام اذہان اس کی مذکورہ بالا تعبیر تک محدود ہیں، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دیگر تصورات پوری طرح مکمل ہو کر نہ تو بیان ہوئے ہیں اور نہ وسیع پیمانے پر معروف ہو سکے ہیں تو ہمیں اپنا یہ خیال درست محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس تصور سے موافقت رکھنے والا ذہن بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ مثلاً احیاء خلافت کا تصور یعنی خلافت راشدہ کو اس کی سوچ کے مطابق دوبارہ روبعمل لانا۔ اس تصور کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اس میں خلافت راشدہ کی ساری حیثیت اور حقیقت سیاسی رنگ لیے ہوئے ہے۔

اسی طرح نشاۃ الثانیہ کا ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ ہم سائنس، ٹیکنالوجی اور مختلف علوم وفنون میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے زوال کا شکار ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان شعبوں پر ترقی یافتہ اقوام کی طرح دسترس حاصل کریں اور خود کو ان اقوام

*ڈپٹی ڈائریکٹر اقبال اکادمی، لاہور

کی صف میں لانے کی کوشش کریں۔ یہ تصور مذہبی حلقوں سے باہر پایا جاتا ہے اور لوگوں میں اس کی مقبولیت پہلے نظریے کے مقابلے میں زیادہ ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہماری رائے میں نشاۃ الثانیہ کی یہ دونوں تعبیرات جزوی فائدے اور کلی نقصان پر منتج ہو سکتی ہے۔

۳۔ یہ بات نشاۃ الثانیہ کی ترکیب سے ظاہر ہے کہ مسلمان امت تاریخ کے کسی مرحلے پر کمال یافتہ تھی اور اب حالت زوال سے نکل کر اسے وہی کمال دوبارہ مطلوب ہے۔ یہاں تک پوری بات ٹھیک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر پہلے ہی قدم پر یہ طے کرنا ہوگا کہ اس امت کو جو کمال حاصل تھا، اس کے واقعی اسباب کیا تھے؟ ان اسباب کی بالکل کلینیکل انداز میں تشخیص ہونی چاہیے۔

۴۔ ایک اور ضروری نکتہ یہ ہے کہ عروج زوال کے تاریخی عوامل کیا ہمیں بعض مظاہر عروج کی باز آفرینی کا موقع دیں گے؟ مذہبی ذہن قوانین تاریخ سے مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے اکثر ناگزیر اور بدیہی رکاوٹوں کی طرف سے آنکھ بند کر لیتا ہے۔ اس روش کا ازالہ کیے بغیر نشاۃ الثانیہ محض ایک خواہش کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتی۔

۵۔ زندگی کے نئے اسالیب خصوصاً انسان کی جدید تہذیبی اور نفسیاتی ساخت کسی عقیدے یا نظریے کی لفظی اور قانونی تعمیم کو قبول نہیں کر سکتی۔ قبول نہ کر سکنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مستقل عقیدے یا نظریے کی طرف ذہنی میلان ہو بھی جائے تو بھی زندگی کے موجودہ اسالیب و اطوار اس عقیدے کو ذہن سے نکال کر اپنے اندر سرایت کر جانے کا راستہ نہیں دیں گے۔ اس صورت حال میں نشاۃ الثانیہ کے کسی بھی تصور کو عملی صورت دینے کی کوشش کرتے وقت اس عالمگیر مجبوری کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، یعنی اس فکر کے حاملین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مزاحمت یا عدم قبولیت کا پیشگی ازالہ کرنے کی کوئی واضح صورت نکالیں، ورنہ دیگر تصورات کی طرح یہ تصور بھی اپنے اطلاق کے امکان کو مستقلاً گنوا بیٹھے گا۔

۶۔ مسلمانوں میں نشاۃ الثانیہ کا حقیقی مقصود یہ ہے کہ آدمی اپنی بنیادوں کی طرف واپس لوٹے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترقی و خوشحالی کا کوئی گزشتہ دور واپس آ جائے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں نشاۃ الثانیہ کا ہر وہ تصور بے معنی ہے جس کا مقصود مسلم ماڈل کی نئی تشکیل کے علاوہ کوئی بات ہو، یعنی ہماری اصل ضرورت عمرؓ ہیں نہ کہ ان کا دور حکومت۔

۷۔ خود مغربی نشاۃ الثانیہ کی تحریک آدمی کی تبدیلی کی تحریک تھی جو بڑی حد تک کامیاب ہوگئی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ انسان میں تبدیلی لائے بغیر حالات کو نہیں بدلا جا سکتا۔ ہمارا سادہ لوح دماغ اس وہم میں مبتلا ہے کہ حالات کو انتظامی، سیاسی یا معاشی طور پر بدل کر یعنی خلافت راشدہ جیسا نظام حکومت لا کر آدمی خود بخود بدل جائے گا جب کہ بات اس کے برعکس ہے۔ آدمی بدلے گا تو حالات بدلیں گے۔ یہ بات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعی اسوۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہے ہیں اور اس کے علاوہ انسانوں میں تجدید و احیاء وغیرہ کی جتنی کامیاب تحریکیں چلی ہیں، ان کے طریق کار سے بھی اس کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

۸۔ جدید مسلم ذہن تاریخ کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ یا اس کی وجہ سے ہم حیات انسانی کے مکینیکل مظاہر (یعنی وہ چیزیں جو زندگی میں خود بخود در آتی ہیں) پر بھی کوئی موقف نہیں رکھتے۔ تہذیب، علم، دنیا، عروج و زوال، نفسیات وغیرہ کے بارے میں ہم اگر کچھ کچے پکے تصورات رکھتے بھی ہیں تو انہیں اپنی اساس ہستی اور

اپنے مقاصد حیات سے کسی بلند سطح پر ہم آہنگ نہیں کر پاتے یا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس کمی کے ہمیں کم از کم دو بڑے نقصانات اٹھانے پڑے۔ ایک تو یہ کہ ہمارا تصور دین سطحی اور یک رُخا ہو کر رہ گیا۔ دوسرے یہ کہ ہم کوئی ایسا تصور انسان قائم اور پیش کرنے کے قابل نہیں رہے جو انسان کو موضوع بنانے والے کسی بھی علم کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔ مثال کے طور پر جدید فلسفۂ قانون پڑھ لیں تو ہمارا موجودہ فقہی ذہن اور اس کا تخلیق کردہ لٹریچر بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح علم بشریات، نفسیات اور بیشتر سماجی علوم انسان کی واقعی حقیقت کی جن گہرائیوں تک عملاً پہنچ چکے ہیں، وہ ہمارے لیے یکسر نامعلوم اور اجنبی ہیں، حالانکہ ان گہرائیوں کی دریافت ہمارا کام ہونا چاہیے تھا تاکہ ہم انسان تک دین کی رسائی کا بڑا دائرہ بنا سکتے۔ ایسے پس ماندہ ذہن میں بننے والے تصورات فطری طور پر تصور کی حیثیت سے بھی ناقص ہوتے ہیں اور علمی جہت سے بھی ناممکن العمل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نشاۃ الثانیہ کا تخیل بھی ذرا سے غور کے بعد خواب کی طرح معلوم ہوتا ہے جس سے تھوڑی دیر کو سکون تو مل جاتا ہے، لیکن اس کی طرف عملی پیش رفت خود اس خواب میں رہنے والے کے لیے ناممکن ہوتی ہے۔

۹۔ ہماری رائے میں نشاۃ الثانیہ کا کوئی تصور اس وقت تک مسلمانوں کے لیے بامعنی نہیں ہے جب تک اس کے اندر مندرجہ ذیل امور کا ادراک نہ پایا جائے:

- عقیدے اور تاریخ کا تعلق
- انسان میں تبدیلی کی صلاحیت
- انسان کا وہ مرکز جو کسی بات کو قبول کر کے اسے تمام سطحوں پر محفوظ کر لیتا ہے اور حالات کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتا
- تہذیب کے اصول تشکیل اور ان کا دین سے تعلق
- بنی نوع انسان میں انفرادیت اور اجتماعیت کا نقطۂ اشتراک
- فضائل انسانی اور ان کی Manifestation کا تنوع
- انسانی زندگی اور قانون
- انسان کی مستقل اور عارضی ضروریات
- تقدیر اور تاریخ
- تقدیر اور انسانی اختیار کے حدود
- انسانی اختیار اور تاریخ کا قانون جبر و تغیر
- انسانوں کے اجتماعی نظام کی معنویت
- نظام زندگی: استقلال اور لچک
- نفس انسانی: استعداد اور محرکات
- دین کا مقصد اصلی

۱۰۔ مندرجہ بالا امور پر ایسا دینی موقف اختیار کرنا جو مبنی بر واقعیت ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان مباحث کی

طرف علمی سفر سے آغاز کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس علم کو ایک نظام تربیت بنایا جائے۔ اس کے بعد کہیں جا کر نشاۃ الثانیہ کا عمل خارج میں اظہار پذیر ہونا شروع ہوگا۔ لہٰذا پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم پوری طرح بدلا جائے اور تعلیم کے مقاصد کو دنیا سے منقطع کیے بغیر دین کے تابع رکھا جائے۔

۱۱۔ موجودہ دور چھوڑی بڑی تمام چیزوں کو ایک نظریاتی کل اور نامیاتی وحدت میں اس طرح ڈھالنا چاہتا ہے کہ ایک ہی تعریف (Definition) سب پر صادق آ سکے۔ اقوام متحدہ کے زیادہ تر منصوبے مثلاً گلوبلائزیشن وغیرہ دراصل اسی ہمہ گیر تقاضے کے مظاہر ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی استعمار کی طرف سے دیگر اقوام کو اپنے تابع کرنے کی جو نہایت باضابطہ کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ محض اس لیے نہیں ہیں کہ ان کے چند سیاسی یا معاشی مفادات کا حصول ممکن ہو جائے، بلکہ اس کے پیچھے ایک نظریہ کارفرما ہے۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ انسان اور اس کے تمام متعلقات یعنی علم، تہذیب وغیرہ کو ایک ہی اصل پر مبنی اور ایک ہی مقصود سے وابستہ ہونا چاہیے۔ اس میں پہلی ضرورت یہ ہے کہ جو ترقی یافتہ اقوام اس اصل اور مقصود کا ادراک رکھتی ہیں یا انہیں وضع کر چکی ہیں، وہ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو اپنے برابر لانے کی بجائے اپنے بنائے ہوئے دائرے میں رکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے ان کی ہر نظریاتی اور تہذیبی تحدید کو توڑنے کے درپے ہو چکی ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں قوموں کی سطح پر نظریاتی اور تمدنی انفرادیت کا اظہار اور اس پر اصرار بنی نوع انسان کی ہم اصلی اور ہم مقصدی کے اس تصور کو عمل میں نہیں لانے دے گا جو ان طاقتور اقوام کے پیش نظر ہے۔ عالم اسلام میں اس خطرے کا احساس اور ادراک بالکل مفقود تو نہیں ہے لیکن جس سطح پر ہے، وہ قطعی غیر موثر ہے اور زندگی کی کسی نظریاتی تشکیل میں کوئی بامعنی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہمارا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے نظریۂ زندگی اور زندگی میں مطابقت کا ہر پہلو غیر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان نظریے یا عقیدے اور زندگی کی پوری عدم مطابقت کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسے ان دو غیر متعلق امور میں سے ایک کو لازماً چھوڑنا پڑتا ہے۔ ابھی وہ صورت حال تو نہیں آئی کہ ہم ترک وقبول کے عمل میں ایک حتمی مقام پر پہنچ گئے ہوں، تاہم ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رخ جس طرف ہو چکا ہے، اس کے پیش نظر یہ بات بہت بعید از قیاس نہیں ہے کہ ہم محض زندہ رہنے پر قانع ہو جائیں اور زندگی کے بارے میں تصورات کو فراموش کر دیں۔ موجودہ حالات میں ایسا ہو جانا تقریباً یقینی دکھائی دیتا ہے اور تاریخ و انسان کے مطالعے کا کوئی طریقہ ہمارے اس خوف کو زائل نہیں کرتا کہ مستقبل میں ہم دنیا کو اپنا علانیہ مقصود بنا کر دین کو ایک غیر ضروری رکاوٹ قرار دے کر اسے عین اس طرح نظر انداز کر بیٹھیں جس طرح جدید مغرب نے عیسائیت کو کر رکھا ہے۔ اس رویے میں دین کی اتنی بھی وقعت نہیں پائی جاتی کہ اس کا انکار کرنے کا تکلف پالا جائے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اسے فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دے کر زندگی کے مرکزی دھارے سے الگ کر دیا جائے۔

فی زمانا جدید مسلم ذہن اسی روش پر چلنے پر راضی نظر آتا ہے کہ دین ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور اسے کاروبار زندگی میں مخل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری مذہبی فکر اس بات کا ایک تحکمانہ قانونی اور سیاسی جواب دے کر مطمئن ہو جاتی ہے اور یہ نہیں دیکھتی کہ جس ذہن میں ایسا خیال آ سکتا ہے، وہ بھلا فتوے یا خطاب کو قبول کرے گا؟ احیائے امت کی کسی بھی کوشش میں ابتدائی طور پر ہی اس روز افزوں ذہنیت کا مکمل تجزیہ کر کے اسے ایک گمراہی کی

بجائے ایک مرض کے طور پر دیکھنا ہوگا اور اس کے ازالے کا طریق کار بھی مناظرے کی جگہ معالجے پر مبنی رکھنا ہوگا۔ یہاں معالجے کا مطلب وعظ ونصیحت نہیں ہے بلکہ کسی خرابی کے بنیادی اسباب کی تشخیص کے بعد ان اسباب کا ایسا ازالہ کرنا ہے کہ ان کی دوبارہ پیدائش کا احتمال نہ رہے اور ان کی کشش انسانوں کے اندر سے ختم ہو جائے۔ انسان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کی عمومی زندگی کے تقریباً تمام اہداف حق و باطل اور صحیح وغلط کے معیارات پر اتنے استوار نہیں ہوتے جتنے کہ پسند و ناپسند پر ہوتے ہیں۔ زندگی انسان کی جس استعداد یا سطح سے فوری اور فطری مناسبت رکھتی ہے، وہ ذہن نہیں ہے بلکہ طبیعت ہے۔ یہ قانون مسلمانوں کے لیے بدل نہیں جاتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمات کی قبیل میں رکھ کر اس کی اپنے نظریات کے مطابق تراش خراش کی جائے یعنی مسلم نشاۃ الثانیہ اگر ایک سلسلہ عمل ہے تو اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں میں سے ایک کڑی یہ ہے کہ زندگی اور طبیعت کا جبری تلازم پورے انسان اور پوری زندگی پر حاوی نہ آ جائے یعنی مسلمان اپنے منہاج حیات میں طبیعت تک محدود نہ ہو کر رہ جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ طبیعت کو نظر انداز کر کے آدمی کے اندر ذہنی یا اخلاقی مقاصد سے مستقلاً وابستہ رہنے کی قوت باقی نہیں رہتی، چونکہ طبیعت منہا ہو جائے تو بڑی سے بڑی چیز بھی اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے اور محض اس کی بڑائی کا ادراک انسان کو اس کے ساتھ جوڑے نہیں رکھ سکتا۔ ہماری اولین ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ ہم اپنے عقیدے کے عملی اور اطلاقی مظاہر کو انسانی نفس اور طبیعت کے لیے ہی قابل قبول بنا دیں تاکہ حق کے ساتھ ہماری وابستگی کی قوت میں ضعف نہ پیدا ہو جائے۔

اس انتہائی بنیادی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور کو خوب غور وفکر کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے:

- دین کی دنیاوی افادیت بھی ثابت کی جائے، علمی سطح پر بھی اور عملی سطح پر بھی۔
- قرآن وسنت سے بلا تاویل مستنبط ہونے والے تصور انسان کو انسان فہمی کے مروجہ معیارات پر حقیقی بنا کر دکھایا جائے اور انسانیت کے اس ٹائپ کو معاشرے میں مدار فضیلت بنایا جائے۔
- وہ علوم جو کائنات اور انسان کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں، انہیں دین کی ثابت شدہ غایات اور مقاصد کے اس طرح تابع رکھا جائے کہ ان علوم کے اپنے اپنے معیارات پر کوئی ضرب نہ لگے۔ مثال کے طور پر نفسیات وغیرہ میں ان تحقیقات کی کوئی حیثیت نہیں جو اس علم کے مسلمہ معیار سے کمتر ہیں۔ ہمارے دور میں اسلامائزیشن آف نالج کی کوششیں اسی لیے دین کی سبکی کا سبب بنی ہیں کہ انہوں نے تمام علوم پر اناڑیوں کی طرح دست اندازی کی ہے۔ انسان کی دنیاوی فلاح کے لیے قائم کیا جانے والا ہر نظام واضح طور پر دینی اساس پر مبنی ہونا چاہیے اور وہ اساس محض قانون کے دائرے تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔
- مسلم نشاۃ الثانیہ کا تصور جن اغراض سے پھوٹا ہے، ان میں ایک کڑی غرض مسلمانوں کے مفوضہ کائناتی کردار کی باز آفرینی ہے یعنی ہم ساری دنیا کے لیے داعی الی الحق بنیں۔ اس دعوت کی داخلی بناوٹ علمی سے زیادہ عملی اور نظریاتی سے زیادہ معاشرتی ہونی چاہیے۔ دین کو معاشرت میں منتقل کیے بغیر نشاۃ الثانیہ کا ہر تصور مہمل ہے۔

۱۰۔ احیائے امت کی کسی بھی تحریک کا انحصار اسی آزمودہ منہج پر ہونا چاہیے جس پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس

منہج کے دو پہلو ہیں، علمی اور عملی۔ علمی منہج جس کی بنیاد عقیدہ ہے، اس کے ضروری اجزا یہ ہیں:

۔ تقویم امت کے حقیقی اصول کی معرفت

۔ اس سوال کا جواب کہ امت کیا ہے اور مسلمانوں کی مختلف تہذیبی اور قومی وحدتیں امت کی وحدت میں ضم ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔

۔ اسلام اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کی درست تشخیص اور ان کے محرکات

۔ اسلام اور اہل اسلام کو درپیش مخالفتوں، مزاحمتوں اور مجبوریوں کی شناخت اور ان کا تجزیہ۔ اس تجزیے کے نتائج کو عروج وزوال کے تاریخی اور نقص وکمال کے اخلاقی قوانین کے اندر رہتے ہوئے مطلوبہ نتائج کے حصول کی ذہنی اور عملی کوششوں کی بنیاد بنانا۔

عملی منہج جس کی بنیاد اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، اس کے بنیادی عناصر یہ ہیں:

۔ زندگی کے موجودہ مقاصد اور دین کے مطلوبہ مقاصد کے درمیان پیدا ہو جانے والے فاصلے کو ختم کرنا

۔ دین کی کلچرلائزیشن

۔ موجودہ معاشرتی اور دین کے نظام فضائل میں ہم آہنگی پیدا کرنا

۔ غربت اور ناانصافی کا ازالہ اور بے تحاشا امارت وغیر محدود ملکیت کا خاتمہ

۔ عورتوں میں مظلومیت اور بے حیائی دونوں کا علاج

۱۱۔ یہ تمام مناہج جس علمی قانون اور اخلاقی اصول پر مبنی ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ مسلم نشاۃ الثانیہ کے عمل میں فرد اور اجتماع دونوں کی یکساں ذمہ داریاں ہیں جن میں بعض مشترک ہیں اور بعض منفرد۔ علمی ذمہ داریوں کا اکثر حصہ افراد سے تعلق رکھتا ہے، قانونی فرائض بیشتر اجتماعی نوعیت کے ہیں اور اخلاقی ذمہ داریاں دونوں میں مشترک ہیں، یعنی نشاۃ الثانیہ کی تیاری جس درست علم، محکم ارادے اور خالص نیت پر موقوف ہے، انہیں حاصل کرنے کے عمل میں خود کو ڈالے بغیر ہم اپنے مطلوبہ نتائج کی طرف پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مسلم نشاۃ الثانیہ صدر اول کے حالات کی بازیابی کا نام نہیں ہے بلکہ اس انسان کے حصول کا نام ہے جسے صدر اول نے ایک مستقل نمونے کے طور پر عملاً تشکیل دیا تھا۔ گویا جب ہم نشاۃ الثانیہ کی آرزو کرتے ہیں تو اس کا واحد مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے موجود ہونے کی تمام بنیادوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کر کے انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں حالات کی یکسر تبدیلی کے باوجود فنکشنل بنانا چاہتے ہیں۔ نشاۃ الثانیہ کا یہ محرک اتنا جامع اور مانع ہے کہ اس میں کسی چیز کمی کی جا سکتی ہے نہ اضافہ۔

امیر عبد القادر الجزائریؒ کون تھے؟

[امیر عبد القادر الجزائری کی شخصیت اور جدوجہد سے متعلق 'الشریعہ' کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی، ماہنامہ ''القاسم'' نوشہرہ کے مدیر مولانا عبد القیوم حقانی اور راقم الحروف کی درج ذیل تحریریں اس سے پہلے 'الشریعہ' کے مارچ ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہیں جنھیں اس موضوع پر حالیہ مباحثے کے تناظر میں دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)]

لاہور کے معروف اشاعتی ادارے ''دار الکتاب'' نے اپنی تازہ ترین مطبوعات میں امریکی مصنف جان ڈبلیو کائزر کی کتاب کا اردو ترجمہ ''امیر عبد القادر الجزائری: سچے جہاد کی ایک داستان'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے دوران مسلم ممالک پر یورپ کے مختلف ممالک کی استعماری یلغار کے خلاف ان مسلم ممالک میں جن لوگوں نے مزاحمت کا پرچم بلند کیا اور ایک عرصہ تک جہاد آزادی کے عنوان سے داد شجاعت دیتے رہے، ان میں الجزائر کے امیر عبد القادر الجزائریؒ کا نام صف اول کے مجاہدین آزادی میں شمار ہوتا ہے جن کی جرات واستقلال، عزیمت واستقامت اور حوصلہ وتدبر کو ان کے دشمنوں نے بھی سراہا اور ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

امیر عبد القادر مئی ۱۸۰۷ء میں الجزائر میں، قیطنہ نامی بستی میں ایک عالم دین اور روحانی راہنما الشیخ محی الدینؒ کے ہاں پیدا ہوئے اور اپنے والد محترم سے اور ان کے زیر سایہ دیگر مختلف علماء کرام سے ضروری دینی وعصری تعلیم حاصل کی اور ان کے ساتھ ۱۸۲۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔

یہ وہ دور تھا جب مغرب کے استعماری ممالک ''انقلاب فرانس'' کی کوکھ سے جنم لینے والی جدید مغربی تہذیب وثقافت کی برتری کے نشے سے سرشار تھے اور سائنسی ترقی سے حاصل ہونے والی عسکری قوت اور ٹیکنالوجی کی صلاحیت نے انھیں پوری دنیا پر حکمرانی کا شوق دلا دیا تھا۔ عالم اسلام کی دو بڑی قوتیں خلافت عثمانیہ اور مغل بادشاہت ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں، چنانچہ برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، پرتگال اور دوسرے ممالک نے ان دونوں قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف اطراف میں یلغار کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ افریقہ اور ایشیا کے ایک بڑے حصے کو نو آبادیات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خلافت عثمانیہ اور مغل بادشاہت کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ سائنسی ترقی اور دنیا میں ہونے والی تہذیبی ومعاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کا بروقت ادراک نہ کر سکیں اور ان کی یہ غفلت استعماری یلغار کے سامنے عالم اسلام کے ایک بڑے علاقے کے سرنڈر ہونے کے اسباب میں ایک اہم سبب ثابت ہوئی۔

بہر حال جب بہت سے مسلم ممالک نے مختلف یورپی ممالک کی نو آبادیاتی غلامی کا طوق گردنوں میں پہنا تو ہر جگہ

حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں نے حالات کے اس جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بہت دیر تک بغاوت اور سرکشی کا محاذ گرم رکھا۔ الجزائر پر فرانس کے تسلط کا آغاز انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب جنوبی ایشیا میں برطانوی تسلط ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہو چکا تھا اور امام ولی اللہ دہلویؒ کے مکتب فکر بلکہ خانوادے سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کا ایک گروہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں پشاور کے علاقے میں جہادی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ ان کا وقتی سامنا اگرچہ سکھوں سے تھا، لیکن اپنے عزائم اور اہداف کے حوالے سے وہ برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد کے لیے بیس کیمپ حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ اس قافلہ حریت نے ۱۸۳۰ء میں پشاور کے صوبہ پر قبضہ اور کم وبیش سات ماہ حکومت کرنے کے بعد ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا تھا۔

الجزائر میں جب ۱۸۳۰ء میں فرانس نے تسلط قائم کرنے کی کوشش کی تو علماء کرام اور مجاہدین کی ایک جماعت نے امیر عبد القادرؒ کے والد محترم الشیخ محی الدینؒ کی قیادت میں تحریک مزاحمت کا آغاز کیا، مگر دو سال کے بعد ۱۸۳۲ء میں یہ دیکھتے ہوئے کہ اس مزاحمت کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہ سکتا ہے، تحریک مزاحمت کی مستقل منصوبہ بندی کی گئی اور الشیخ محی الدین کے جواں سال اور جواں ہمت بیٹے امیر عبد القادر کو باقاعدہ امیر منتخب کر کے مزاحمت کی جدوجہد کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

امیر عبد القادرؒ جذبہ جہاد کے ساتھ ساتھ فراست وتدبر کی نعمت سے بھی مالا مال تھے، اس لیے انھوں نے اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے الجزائری عوام اور قبائل کو اعتماد میں لیا، وسیع تر مشاورت کا سلسلہ قائم کیا، آزادی کی فوج کو وقت کے ہتھیاروں اور جنگ کی نئی تکنیک سے مسلح کیا اور ایک باقاعدہ فوج منظم کر کے الجزائر پر حملہ آور فرانسیسی فوجوں کے خلاف میدان جنگ میں نبرد آزما رہے۔ انھوں نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک مسلسل سولہ سال تک فرانسیسی فوجوں کے خلاف جنگ لڑی، بہت سے معرکوں میں فرانسیسی فوجوں کو شکست سے دوچار کیا اور ایک بڑے علاقے پر کنٹرول حاصل کر کے امارت شرعیہ کا نظام قائم کیا۔ وہ اس وقت تک لڑتے رہے جب تک الجزائری عوام اور اسباب ووسائل نے ان کا ساتھ دیا اور جب حالات کی نامساعدت نے انھیں بالکل تنہا کر دیا اور الجزائر کے قبائل ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے تو ۱۸۴۸ء میں انھوں نے اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

انھیں گرفتار کر کے ۱۸۵۳ء تک فرانس کے مختلف قلعوں میں محبوس رکھا گیا اور پھر آزاد کر کے دمشق کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ انھوں نے ۲۳ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ایک مشروط معاہدے کے تحت خود کو فرانسیسیوں کے حوالے کیا تھا، مگر ان کی شرائط کو قبول کیے جانے کے بعد بھی حسب معمول بالائے طاق رکھ دیا گیا تو ایک موقع پر انھوں نے اس حسرت کا اظہار کیا کہ:

> ''اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ ہونا ہے جو ہو رہا ہے تو ہم جنگ ترک نہ کرتے اور مرتے دم تک لڑتے ہی رہتے۔''

وہ پہلے استنبول گئے اور پھر خلافت عثمانیہ کی ہدایت پر دمشق آ گئے جہاں انھوں نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر

دیا۔ وہ مالکی فقہ کے بڑے علما میں سے تھے اور تصوف میں الشیخ الاکبر محی الدین بن عربیؒ کے پیروکار اور ان کے علوم کے شارح تھے۔ دمشق میں قیام کے دوران انھیں ایک اور معرکے سے سابقہ درپیش ہوا کہ خلافت عثمانیہ کی طرف سے شام میں مقیم مسیحیوں پر جزیہ کا قانون تبدیل کیے جانے کے بعد اس مسئلے پر مسلم مسیحی کشمکش کا آغاز ہوا اور بہت سے حلقوں کی طرف سے قانون کی اس تبدیلی کو ناکام بنانے کے لیے مسیحیوں کے خلاف مسلمان عوام کو بھڑکانے کا سلسلہ شروع کیا گیا جس پر امیر عبد القادر الجزائریؒ نے مسیحیوں کے خلاف اس یلغار کی مخالفت کی اور ان کی حمایت وتحفظ کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ اس وقت غصے میں بپھرے ہوئے عوام کے لیے امیر عبد القادر کا یہ اقدام قابل اعتراض تھا، لیکن وہ اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ بے گناہ مسیحیوں کی جانیں بچانا ان کا شرعی فریضہ ہے اور وہ ایسا کر کے اپنے اسلامی فرض کی تکمیل کر رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ امیر عبد القادر الجزائری کے اس جرات مندانہ اقدام کی وجہ سے کم وبیش پندرہ ہزار مسیحیوں کی جانیں بچیں جس کی وجہ سے انھیں مغربی دنیا میں بھی تحسین کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور انھیں ''امن کا ہیرو'' قرار دے کر مغرب کے چوٹی کے سیاسی راہ نماؤں اور دانش وروں نے خراج تحسین پیش کیا، جبکہ نیویارک ٹائمز نے ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ ''عبد القادر کے لیے یہ یقیناً عظمت کا اور حقیقی شان وشوکت کا باب ہے۔ اس بات کو تاریخ میں رقم کرنا کوئی معمولی بات نہیں کہ مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑنے والا سب سے ثابت قدم سپاہی اپنے سیاسی زوال اور اپنی قوم کے ناگفتہ بہ حالات میں عیسائیوں کی زندگیوں اور حرمت کا سب سے نڈر نگہبان بن کر سامنے آیا۔ جن شکستوں نے الجزائر کو فرانس کے آگے جھکایا تھا، ان کا بدلہ بہت حیرت انگیز طریقے سے اور اعلیٰ ظرفی سے لے لیا گیا ہے۔''

امیر عبد القادر الجزائری کا یہ کردار دیکھ کر مجھے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایک بڑے لیڈر مولانا عبید اللہ سندھیؒ یاد آ جاتے ہیں اور مجھے ان دونوں بزرگوں میں مماثلت کے بعض پہلو بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً مولانا عبید اللہ سندھیؒ اگرچہ میدان جنگ کے نہیں، بلکہ میدان فکر وسیاست کے جرنیل تھے، مگر ان کی سوچ یہ تھی کہ ہمیں سیاست وجنگ کے روایتی طریقوں پر قناعت کرنے کی بجائے ان جدید اسالیب، تکنیک اور ہتھیاروں کو سیاست اور جنگ کے دونوں میدانوں میں اختیار کرنا چاہیے اور وہ عمر بھر اسی کے داعی رہے۔

انھوں نے جب دیکھا کہ وہ حرب وجنگ کے ذریعے سے برطانوی تسلط کے خلاف جنگ جیتنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو انھوں نے اس معروضی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کے لیے عدم تشدد کا راستہ اختیار کر لیا اور بقیہ عمر پرامن جدوجہد میں بسر کر دی۔

امیر عبد القادر کی طرح مولانا سندھی نے بھی عملی تگ وتاز کے میدان کو اپنے لیے ہموار نہ پاتے ہوئے تعلیم وتدریس کا راستہ اختیار کیا اور ہندوستان واپسی کے بعد دہلی اور دوسرے مقامات میں قرآن کریم کے تعلیمی حلقے قائم کر کے اپنے فکر وفلسفہ کی تدریس وتعلیم میں مصروف ہو گئے۔

مولانا سندھیؒ مغربی تہذیب وثقافت اور تکنیک وصلاحیت کی ہر بات کو مسترد کر دینے کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی ان باتوں کو اپنانے کے حامی تھے جو اسلامی اصولوں سے متصادم نہیں ہیں اور ہمارے لیے ضروری ہیں۔ اس کی وجہ سے

انھیں بہت سے حلقوں کی طرف سے مطعون بھی ہونا پڑا۔

امیر عبد القادر الجزائری کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا پیروکار، ان کے علوم کا شارح اور ان کے فلسفہ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے ان کے فکر کے ڈانڈے ''وحدت ادیان'' کے تصور سے ملانے کی کوشش کی گئی (جس کی جھلک جان کائزر کی زیر نظر کتاب میں بھی دکھائی دیتی ہے)، حالانکہ وحدت الوجود اور وحدت ادیان میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدت الوجود کا مطلب وحدت ادیان ہرگز نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی فرنگی تسلط کے خلاف سیاسی طور پر ہندوستانی اقوام کے ''متحدہ قومیت'' کے نظریہ پر ہدف تنقید بنایا گیا اور انھیں ''وحدت ادیان'' سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔

امیر عبد القادر الجزائریؒ مغربی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جوش ومزاحمت کی علامت تھے اور وہ اپنی جدوجہد میں جہاد کے شرعی واخلاقی اصولوں کی پاس داری اور اپنے اعلیٰ کردار کے حوالے سے امت مسلمہ کے محسنین میں سے ہیں۔ ان کے سوانح وافکار اور عملی جدوجہد کے بارے میں جان کائزر کی یہ تصنیف نئی پود کو ان کی شخصیت اور جدوجہد سے واقف کرانے میں یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ ایسی شخصیات کے ساتھ نئی نسل کا تعارف اور ان کے کردار اور افکار وتعلیمات سے آگاہی استعماری تسلط اور یلغار کے آج کے تازہ عالمی منظر میں مسلم امہ کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور اس سمت میں کوئی بھی مثبت پیش رفت ہمارے لیے ملی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ابو عمار زاہد الراشدی)

جان ڈبلیو کائزر ایک معروف امریکی مصنف ہیں۔ تین چار سال قبل ان کی طرف سے Commander of the Faithful (امیر المومنین) کے زیر عنوان ان کی ایک تصنیف کا انگریزی مسودہ تنقیدی جائزہ کی غرض سے مجھے موصول ہوا۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے نصف اول میں الجزائر میں فرانس کے استعماری تسلط کے خلاف آزادی کی جدوجہد کرنے والے نامور مسلمان راہ نما امیر عبد القادر الجزائری کی سوانح حیات سے متعلق ہے اور بحیثیت مجموعی مستند تاریخی واقعات پر مبنی ہوتے ہوئے کسی حد تک ناول کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مجھے اس سے قبل امیر عبد القادر کی حیات اور ان کی جدوجہد سے متعلق زیادہ تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کائزر کے ارسال کردہ مسودے نے اس کی تحریک پیدا کی اور میں نے ان کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ امیر عبد القادر کی حیات کے بارے میں عربی اور انگریزی میں میسر دیگر مواد کا بھی مطالعہ کیا جو میرے لیے ایک ایمان افروز تجربہ تھا۔

میں نے کتاب سے متعلق اپنے مختصر تاثرات مصنف کو بھجوائے تو اس میں یہ تجویز بھی دی کہ اس کتاب کا عربی، اردو اور دیگر مشرقی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے، کیونکہ امیر عبد القادر کو جن حالات کا سامنا تھا اور انھوں نے جن شرعی واخلاقی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک غاصب استعماری طاقت کے خلاف جدوجہد کی، وہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے تصور جہاد کی بڑی حد تک درست ترجمانی کرتی ہے، بلکہ اس میں عصر حاضر کے ان جہادی عناصر کے لیے بھی راہ نمائی کا بڑا سامان موجود ہے جو بدقسمتی سے اشتعال اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر جہاد سے متعلق واضح شرعی وفقہی اصولوں کو نظر

انداز اور پامال کرنے پر اتر آئے ہیں اور یوں اپنی جدوجہد سے الٹا اسلام اور امت مسلمہ کے لیے بدنامی اور نقصان کا باعث بن رہے ہیں۔ مختلف زبانوں میں کتاب کے ترجمے کا خیال غالباً پہلے سے کائزر کے ذہن میں تھا۔ بہرحال اس کی طرف پیش رفت ہوئی اور ایک فاضل مترجم نے (جن کا نام میرے علم میں نہیں) اسے اردو میں منتقل کر دیا۔

اردو ترجمے پر نظر ثانی اور اس کی تسہیل کے لیے مسودہ دوبارہ مجھے بھجوایا گیا اور بحمد اللہ اس کے اردو متن کو آخری شکل دینے اور پھر پاکستان میں اس کی اشاعت کا انتظام کرنے میں مجھے بھی حصہ ڈالنے کا موقع ملا۔ اردو بازار، لاہور کے اشاعتی ادارے، دارالکتاب کے مالک اور ہمارے دوست حافظ محمد ندیم صاحب نے ازراہ عنایت اس کی اشاعت کے لیے آمادگی ظاہر کی اور چند ماہ قبل یہ کتاب ''امیر عبد القادر الجزائری: سچے جہاد کی ایک داستان'' کے عنوان سے دارالکتاب کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

انیسویں صدی میں عالم اسلام کی وہ شخصیات جنھوں نے مسلم ممالک پر یورپ کے مختلف ممالک کی استعماری یلغار کے خلاف مزاحمانہ جدوجہد کی، ان میں الجزائر کے امیر عبد القادر الجزائریؒ کا نام اس حوالے سے ممتاز ہے کہ ان کی جرات واستقلال، عزیمت واستقامت، حوصلہ وتدبر اور فکر وکردار کی عظمت کو ان کے دشمنوں نے بھی سراہا اور ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔ امیر عبد القادر نے انیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد کی اور ایک ایسا نمونہ پیش کیا جسے بلاشبہ اسلام کے تصور جہاد اور جنگی اخلاقیات کا ایک درست اور بڑی حد تک معیاری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ امیر عبد القادر کے تصور جہاد کے اہم اور نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے ملک پر کسی غیر مسلم طاقت کے تسلط کی صورت میں اس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ایک شرعی اور دینی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی جذبے سے روحانی غور وفکر اور تعلیم وتدریس کی زندگی کو ترک کر کے فرانس کے خلاف مسلح جدوجہد آزادی کو منظم کیا۔

۲۔ ان کے ہاں جہاد کا مقصد طاقت یا اقتدار کا حصول نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے جدوجہد آزادی کی قیادت خود سنبھالنے سے قبل بھی شاہ مراکش سے درخواست کی کہ وہ اس جدوجہد کی سرپرستی اور راہ نمائی کریں اور پھر جب ایسا نہ ہو سکنے کی وجہ سے انھیں خود اس جدوجہد کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالنا پڑی تو الجزائر کے ایک وسیع علاقے میں اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے بعد انھوں نے دوبارہ شاہ مراکش کو خط لکھا کہ وہ اس الجزائر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیں اور یہاں کے معاملات کو چلانے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ مقرر کر دیں۔

۳۔ امیر کے ہاں اس امر کا احساس بھی بہت واضح ہے کہ کسی غیر ملکی طاقت کے خلاف جدوجہد آزادی چند لازمی شرائط کے پورا ہونے پر منحصر ہے اور ان کو پورا کیے بغیر کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے نہایت دانش مندی سے یہ سمجھا کہ مسلح جدوجہد کا فیصلہ کسی فرد یا کسی گروہ کو اپنے طور پر نہیں بلکہ پوری قوم کے اتفاق رائے سے کرنا چاہیے تاکہ جدوجہد مضبوط اخلاقی اور نفسیاتی بنیادوں پر قائم ہو اور اسے قوم کی اجتماعی تائید حاصل ہو، کیونکہ اگر قوم ہی اس جدوجہد کے نتائج کا سامنا کرنے اور اس کے لیے درکار جانی اور مالی قربانی دینے کے حوصلے سے محروم ہو تو کوئی

گروہ اپنے بل بوتے پر اسے کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے امیر نے فرانس کے خلاف لڑائی شروع کرنے سے پہلے الجزائر کے بڑے بڑے قبائل کے سرداروں سے مشاورت کر کے ان کی تائید اور حمایت کو یقینی بنایا۔ اسی طرح امیر نے یہ بات بھی وضاحت سے کہی کہ ایک منظم فوج کے خلاف جنگ کسی دوسری منظم طاقت کی سرپرستی کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی، چنانچہ انھوں نے ابتدا شاہ مراکش سے اس جدوجہد کی سیاسی سرپرستی کی درخواست کی اور پھر اس میں ناکامی کے بعد الجزائر کی نمائندہ قبائلی طاقتوں کی تائید سے اپنی امارت قائم کرنے کے بعد ہی عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔

۴۔ امیر عبد القادر نے اس بدیہی حقیقت کا بھی ادراک کیا کہ جنگ میں فریقین کے مابین طاقت کے ایک خاص توازن اور عسکری تربیت میں دشمن کی برابری حاصل کیے بغیر زیادہ دیر تک میدان جنگ میں نہیں ٹھہرا جا سکتا، چنانچہ انھوں نے اپنی فوج کو مغربی طرز پر منظم کیا اور جدید طرز کی اسلحہ سازی کے لیے مغربی ملکوں سے مطلوبہ سامان اور ماہرین فراہم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی۔ امیر کی حکمت عملی کا یہ پہلو بھی بے حد قابل توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کا ہدف کسی نظری آئیڈیل کی روشنی میں نہیں بلکہ زمینی حقائق کی روشنی میں متعین کیا اور الجزائر کی سرزمین سے فرانس کو کلیتًا بے دخل کر دینے کو اپنا ہدف قرار دینے کے بجائے اس بات کو قبول کیا کہ فرانس کی عمل داری ساحلی شہروں تک محدود رہے جبکہ الجزائر کے باقی علاقے میں مسلمانوں کی ایک آزاد امارت قائم ہو۔

۵۔ امیر کے ہاں عملی حقائق کے ادراک کا ایک ممتاز پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے عالمی حالات اور دنیا کے تہذیبی ارتقا پر نظر رکھتے ہوئے درست طور پر یہ سمجھا کہ مغربی اقوام نے تمدن اور سائنس کے میدان میں جو ترقی کی ہے، وہ درحقیقت انسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور مسلمان بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، چنانچہ انھوں نے نہ صرف فرانسیسی حکمرانوں کے نام خطوط میں جا بجا اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ فرانس اور الجزائر کے مابین دشمنی کے بجائے دوستی کا تعلق قائم ہونا چاہیے تاکہ دونوں قومیں مفادات کے اشتراک کی بنیاد پر ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکیں، بلکہ عملاً بھی اپنی امارت کے تحت الجزائری قوم کی تنظیم نو میں امیر نے مغرب کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

۶۔ امیر کی جدوجہد سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے جان و مال کو جنگ میں بے فائدہ ضائع کروانے اور ایک لاحاصل جدوجہد کو جاری رکھنے کو شرعی تقاضا نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک کسی غیر مسلم قابض کے خلاف جہاد کی ذمہ داری اسی وقت تک عائد ہوتی ہے جب تک اس کی کامیابی کے لیے درکار عملی اسباب و وسائل میسر اور امکانات موجود ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جدوجہد کے آخری مرحلے پر جب یہ دیکھا کہ الجزائری قوم ان کا ساتھ چھوڑ کر فرانسیسی کیمپ کا حصہ بن چکی ہے اور خود ان کے ساتھ وابستہ ایک چھوٹا سا گروہ بھی مسلسل خطرے میں ہے تو انھوں نے کسی جھجک کے بغیر نہایت جرات سے یہ فیصلہ کر لیا کہ الجزائر کی سرزمین پر فرانس کی حکمرانی خدا کی منشا ہے اور اس کو تسلیم کر لینا ہی دانش مندی ہے۔

۷۔ امیر عبد القادر کے تصور جہاد کا ایک نہایت اہم پہلو اسلام کی جنگی اخلاقیات کی پابندی کرنا ہے اور اس ضمن میں

ان کا پیش کردہ نمونہ ہی دراصل مغربی دنیا میں ان کے تعارف اور تعظیم واحترام کی اصل وجہ ہے۔ امیر نے نہ صرف جدوجہد آزادی کے دوران میں فرانسیسی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مذہبی ضروریات کا فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی سے بندوبست کیا بلکہ دمشق میں رہائش کے زمانے میں ۱۸۶۰ میں ہونے والے مسلم مسیحی فسادات میں بھی ہزاروں مسیحی باشندوں کی حفاظت کے لیے عملی کردار ادا کر کے اسلامی اخلاقیات کی ایک معیاری اور قابل تقلید مثال پیش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ تمام حوالوں سے امیر عبدالقادر کی جدوجہد عصر حاضر میں مغرب کے سیاسی واقتصادی تسلط کے خلاف عسکری جدوجہد کرنے والوں گروہوں کے لیے اپنے اندر راہ نمائی کا بڑا سامان رکھتی ہے اور امیر عبدالقادر کے فلسفہ جنگ اور طرز جدوجہد کے ان پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

(محمد عمار خان ناصر)

امیر عبدالقادر الجزائری (۱۸۰۷ء-۱۸۸۳ء) تحریک آزادئ الجزائر کے عظیم مجاہد اور سرفروش قائد وراہنما تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں الجزائر پر فرانس کے غاصبانہ قبضے کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور الجزائری قوم میں اسلامیت کی لہر دوڑا دی۔ الجزائر کے مختلف قبائل کو متحد کیا اور ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ وہ تیرہ سال تک اس اسلامی مملکت کے امیر رہے۔ اس دوران انھوں نے کئی بار فرانسیسی افواج کو ناکوں چنے چبوائے، مگر اپنوں کی غداری کی وجہ سے انھیں بالآخر فرانس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کچھ شرائط کے ساتھ معاہدہ ہوا اور امیر نے خود کو فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا جنھوں نے اپنے وعدوں کی پاس داری نہ کرتے ہوئے انھیں برس ہا برس تک قید میں رکھا۔ پھر فرانس لے جائے گئے اور وہاں نظر بند رہے اور آخر رہا کر کے جلاوطن کر دیے گئے۔ عمر کا آخری حصہ دمشق میں گزرا تا آنکہ وقت آخر آ گیا۔

امریکی مصنف جان ڈبلیو کائزر کی یہ کتاب (اردو ترجمہ) اسی مرد مجاہد کے سچے جہاد کی داستان ہے جس کے مطالعہ سے انسانی فکر ونظر کے تغیر وتبدیل اور ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے، مسلمان کس قدر سادہ اور اعتماد کرنے والا ہوتا ہے جبکہ اہل یورپ کس قدر عیار اور بدعہد ہوتے ہیں۔ وہ معاہدوں کی پاس داری نہیں کرتے، بلکہ معاہدے کرتے ہی اس لیے ہیں کہ انھیں توڑا جائے اور کمزور کی بے بسی اور بے سروسامانی کے مزے لیے جائیں۔

یہ کتاب انسانی زندگی کے نشیب وفراز کی کہانی ہے کہ جوانی میں انسانی رگوں میں خون نہیں، سیال فولاد دوڑتا ہے۔ وہ پہاڑوں سے ٹکراتا اور سمندروں کو پھلانگتا ہے، مگر جب عمر ڈھلتی ہے تو پھر اس کی سوچ بدل جاتی ہے اور پھر کچھ ایسا کرنا چاہتا ہے جس سے دوسروں کو سکھ اور چین میسر آئے۔ امیر عبدالقادر نے جب فرانس کی بھرپور حربی طاقت کے مقابلے میں اپنی فوجی قوت کا جائزہ لیا تو مکمل تباہی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ایسے وقت میں انھوں نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا اور اپنے ہم وطنوں اور ساتھیوں کو مروانے کے بجائے زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنی قیمت پر اپنی قوم کو زندگی دی۔ ایک دانش مند قائد کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنی فکر کی بجائے قوم کے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اہل یورپ سے شکست کھائی، اپنے ہی گھر کے چراغوں کی غداری سے کھائی اور یہ بھی یورپی ممالک کس طرح دوسرے ممالک کے قائدین، تحریکوں اور نظریات کے بارے میں اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ کتاب یورپی اور مغربی نفسیات کا پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ تاریخ میں ''امیر عبدالقادر'' کی صورت میں رہ کر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے اور مسلمان صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، انسانوں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔

ایک وہ وقت تھا جب امیر یورپ کی نظروں میں وقت کے سب سے بڑے دہشت گرد تھے اور جب انھوں نے دمشق میں قیام کے دوران مسلم عیسائی فسادات میں پندرہ ہزار عیسائیوں کی جانیں بچائیں تو انھیں امن کا عظیم علمبردار اور دیوتا قرار دے دیا گیا۔

یہ کتاب معروضی حالات سے آنکھیں بند کر کے محض جوش سے کام لینے والے روایتی دوستوں کو شاید پسند نہ آئے، مگر سعید روحوں کے لیے اس میں بڑے سبق ہیں۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب حالات موافق نہ ہوں تو خود کو اور اپنی قوم کو بچا لینا سب سے بڑی بہادری ہوتی ہے۔ امیر صرف جنگجو رہنما ہی نہ تھے، ایک جید عالم دین اور صوفی بزرگ بھی تھے۔ ان کے یہ الفاظ ہم سب کے لیے بالعموم اور وراثت پیغمبر کے حاملین کے لیے خاص پیغام رکھتے ہیں:

> ''پیغمبر ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے، کم از کم بنیادی اصولوں کی حد تک تو نہیں کرتے۔ ان سب کا ایک ہی پیغام ہے کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو اور مخلوق کے ساتھ رحم دلی سے پیش آؤ۔'' (ص: ۳۸۵)

اہل علم کو سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی ان کے شب و روز اپنے ہی لوگوں کی تردید و تغلیط میں نہیں جا رہے؟ اس کتاب کا مقدمہ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے لکھا ہے اور امیر کا تعارف کروایا ہے جو بجائے خود ایک معرکتہ الآرا مقالہ ہے۔ دار الکتاب لاہور کے حافظ محمد ندیم صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ''القاسم'' محسوس کرتا ہے کہ اگر کتاب کا مطالعہ اس کی روح کے مطابق کیا جائے تو ذہنوں میں انقلاب آئے گا جو آج کے دور میں امت مسلمہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ بہ حیثیت مسلمان ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہر ایک سے جنگ و جدل، مخالفت اور مخاصمت نے ہمیں کیا دیا ہے؟ کیا ہم ''مسلمان'' بن کر نہیں رہ سکتے؟

(تبصرہ نگار: مولانا عبدالقیوم حقانی، ماہنامہ ''القاسم''، نوشہرہ)

خریدار حضرات کی توجہ کے لیے

جن حضرات کا سالانہ زر تعاون ختم ہو چکا ہے، از راہ کرم بروقت تجدید فرما لیں۔ تمام خریدار حضرات سے درخواست ہے کہ رابطے میں سہولت کے لیے اپنا نام، پتہ اور موبائل نمبر 0306-6426001 پر ارسال فرما دیں۔ شکریہ! (ناظم ترسیل)

مفتی ابولباہ شاہ منصور

جعلی مجاہد کی اصلی داستان

قارئین کرام! آپ کو علم ہوگا کہ ضرب مومن میں کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جاتے یا بہت ہی کم شائع کیے جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی علم ہوگا (راقم الحروف پہلے بھی لکھ چکا ہے) کہ احقر کتابوں کا تعارف یا تقریظ لکھنے سے حتی الامکان کتراتا ہے۔ اپنی کتابوں پر بھی اپنے بڑوں کو تقریظ لکھنے کی زحمت دینا اچھا نہیں سمجھتا۔ مروجہ تقاریظ، کتاب، مصنف اور صاحب تقریظ سب کی ساکھ گرانے کا باعث لگتی ہیں۔ کتاب چاولوں کی دیگ نہیں کہ چند چاول دیکھ کر ساری دیگ کو دم لگ جانے کی خوشخبری سنا دی جائے، لیکن آج اس اصول کو توڑتے ہوئے ہم اپنے آپ کو ایک انوکھی مجرمانہ کتاب کا تعارف کروانے پر مجبور پاتے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرے کا خیال بھی ہمیں پیدا نہ ہوتا اگر ہمیں پاکستان میں جدید شرعی واخلاقی اقدار کے علمبردار چند سو کا عدد اشاعت رکھنے والے ایک رسالے کا تازہ شمارہ دیکھنے کو نہ ملتا جس میں خیر سے ایک ''سچے مجاہد کی داستان حیات'' قسط وار دی گئی ہے جو ایک ایسی کتاب سے ماخوذ ہے جس کے مترجم وناشر اس کے نسب کی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہ تھے، لیکن آخر کار یہ تہمت ثبوتوں کے ساتھ سچی ثابت ہوئی اور یہ ناجائز تخلیق ان کے ذمہ لگ رہی۔

یہ کتاب ہمیں کچھ عرصے پہلے ایک مہربان دوست خالد جامعی صاحب نے دکھائی جو مطالعے کے انتہائی شوقین ہیں۔ خود کئی کتابوں کے مصنف ومترجم ہیں اور لکھنا پڑھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بندہ نے پہلی نظر میں بھانپ لیا کہ انگریزی میں لکھی گئی اس کتاب کا مصنف ایوارڈ یافتہ فری میسن ایجنٹ ہے۔ کتاب کا موضوع جو شخصیت ہے، وہ بھی سند یافتہ فری میسن ایجنٹ ہے۔ کتاب کے مترجم کا نام غائب ہے اور اسے جس ناشر نے چھاپا ہے، اس سے رابطہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب اس کے ادارے کے نام سے کسی اور نے چھاپی ہے اور وہ نہیں جانتے کہ شائع کنندگان کے مقاصد کیا ہیں؟ مزید کھوج لگائی گئی تو پتا چلا کہ اس کتاب کی تعارفی تقریب لاہور کے ایک ہوٹل میں امریکی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری کی سربراہی میں منعقد ہوئی تھی اور تقریب کی نظامت ہمارے ممدوح ''غامدی اصغر'' کر رہے تھے۔ وہی اس کتاب کے ناشر ہیں اور انھوں نے اپنی ایک اور ناجائز تخلیق جو مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ہے، بھی اس ادارے کے نام سے اسی جبری نام لگوائی والے طریق کار کے تحت چھپوائی ہے۔

راقم کو اس پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا، کیونکہ وہ ایک انھی صاحبزادے کو نہیں، صاحبزادگان کی ایک ایسی کھیپ کو جانتا ہے جو ''اس جیسے کام اس جیسے انداز میں'' انجام دینے کے لیے بیرونی سفارت کاروں کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہی

ہے، البتہ تعجب اس ڈھٹائی اور بے باکی پر ہوا کہ غامدیت کے اس نوخیز ترجمان نے پچھلے دنوں اپنے تحریفی اقدار کے علمبردار رسالے میں یہ بحث شائع کی تھی کہ افغانستان کا جہاد اعلیٰ اخلاقی اقدار کے تحت کیا جانے والا جہاد نہیں ہے، موجودہ شمارے میں اسی کتاب میں ''سچے مجاہد کی داستان'' کو قسط وار کیسے شائع کر دیا؟ کیا قلم کی دنیا اور علم کی قلم رو میں شرم ومروت کا اتنا بھی گزر نہیں رہا کہ انسان اپنے پڑوس میں ہونے والے جہاد عظیم کے بارے میں دو اچھے لفظ نہ کہے اور پچھلی صدی میں مصدقہ یہودی گماشتے [اس کی ناقابل تردید تصدیقات خود زیر نظر کتاب سے بھی آ رہی ہیں] کے شکست خوردہ جہاد کو 'سچے جہاد' کا نام دے۔ یہودیت کی خانہ ساز غامدیت کے علمبردارو! خدا کا واسطہ ہے، کچھ تو لحاظ کرو۔ کوئلوں کی دلالی میں کیوں اپنا آپ کالا کرتے ہو؟؟

جو بھی شخص دنیا میں ایسے واقعات کے پیچھے نادیدہ ہاتھ تلاش کرتا ہے جو سمجھ میں آ کے نہیں دیتے، اسے دنیا کو مصائب وآلام میں مبتلا کرنے والی پھٹکاری تنظیم ''فری میسن'' تک سراغ جاتے دکھائی دیتے ہیں اور جو شخص بھی فری میسن کی آلہ کار شخصیات سے واقفیت رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ امیر عبدالقادر جزائری نام کا نام نہاد مجاہد فری میسن ایجنٹ بن گیا تھا۔ یہودی آلہ کاروں پر کام کرنے والے ایک سے زیادہ محققین کا حوالہ میرے پاس ہے جنھوں نے اسے یہود کا گماشتہ لکھا ہے۔ مجھے ان کو پیش کرنے کی ضرورت پڑتی تو ان کے استناد پر بحث شروع ہو جاتی، لیکن خدا کا کرنا یہ کہ ''سچے جہاد کی داستان'' نامی اس کتاب میں ہی اس کی تصدیق مل گئی ہے، لہٰذا اب اس کی خارجی توثیق کی ضرورت نہیں۔ غامدی صاحبان شاید کتاب دیکھے بغیر اس کی ''سمساری'' قبول کر لیتے ہیں اور پھر حق نمک ادا کیے بغیر اس کا جائزہ لینے سے پہلے چھاپ بھی دیتے ہیں تاکہ ان کی حماقت اور خیانت کی سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

کتاب کے وقیع پیش لفظ میں ہماری ایک انتہائی موقر علمی شخصیت نے اس کتاب کا بے نام ونسب اردو ترجمہ پاکستان میں شائع کرنے کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''امیر عبدالقادر الجزائریؒ مغربی استعمار کے تسلط کے خلاف مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جوش ومزاحمت کی علامت تھے اور وہ اپنی جدوجہد میں جہاد کے شرعی واخلاقی اصولوں کی پاس داری اور اپنے اعلیٰ کردار کے حوالے سے امت مسلمہ کے محسنین میں سے ہیں۔ ان کے سوانح وافکار اور عملی جدوجہد کے بارے میں جان کائزر کی یہ تصنیف نئی پود کو ان کی شخصیت اور جدوجہد سے واقف کرانے میں یقیناً مفید ثابت ہوگی۔'' (ص ۱۱)

آیئے، دیکھتے ہیں جہاد کے شرعی واخلاقی اصولوں کا پاسدار امت مسلمہ کا یہ محسن کون تھا؟ اور نئی پود کو ان کی شخصیت اور جدوجہد سے واقف کروانے کے مقاصد کیا ہیں؟ ہم دور نہیں جاتے، اسی کتاب کے ص ۴۳۸ پر سچے مجاہد کے پیچھے موجود جھوٹے پشت پناہوں کا صاف ستھرا سراغ ملتا ہے۔ مصنف رقم طراز ہے: ''جب جنرل اوٹ پول اپنے تصور میں امیر کے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو پیرس میں فرانسیسی میسونی لاج ''ہنری چہارم'' کی ایک کمیٹی بڑی احتیاط سے امیر کے نام ایک خط تیار کر رہی تھی اور اس کے ساتھ موزوں عبارت والا ایک قیمتی زیور بھی منتخب کیا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک مہینے کی عرق ریزی کے بعد سولہ نومبر کو میسونی تنظیم کی علامت سے ڈھکے سبز جڑاؤ تمغے کے ہمراہ یہ خط ''انتہائی عزت مآب جناب عبدالقادر'' کی خدمت میں ڈاک سے روانہ کر دیا گیا۔ تنظیم کا نشان دائرے کے اندر دو چوکھٹوں پر مشتمل تھا جس سے ایک ہشت پہلو شکل بنتی تھی جس سے روشنی کی شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ عین درمیان میں فیثا غورث کی

مساوات کندہ تھی۔'' [یہودیوں کی مخصوص پسندیدہ علامت اس مساوات کا کچھ بیان آگے چل کر آئے گا]۔

مسجع ومقفع انداز میں لکھی گئی عبارت کے آخر میں امیر کو تنظیم کا رکن بننے کی دعوت دی گئی تھی: ''بہت سے دل ایسے ہیں جو آپ کے دل کے ساتھ دھڑکتے ہیں، بہت سے بھائی ایسے ہیں جو آپ کو اپنا سمجھتے ہوئے آپ سے محبت کرتے ہیں اور اگر وہ آپ کو اپنی تنظیم کا رکن شمار کر سکیں تو انہیں بہت فخر ہوگا۔'' (ص ۴۳۸، ۴۳۹)

''عالمی برادری'' میں شمولیت کی اس دعوت کو قبول کرنے میں سچے غامدی مجاہد نے دیر نہیں لگائی۔ چنانچہ ''۱۸۶۴ء میں امیر کو دمشق میں شام کے میسونی لاج کا اعزازی گرینڈ ماسٹر نامزد کیا گیا۔ اس کے ایک برس بعد جب عبدالقادر فرانس گیا تو اسے فرانسیسی لاج ''ہنری چہارم'' میں شامل کر لیا گیا جس میں بنجمن فرینکلن، لاپلاس، لافاییٹ، وولٹیئر، سوٹ، مونجے، تالے راں، پرودوں اور دیگر ایسی ممتاز ہستیاں موجود تھیں جن کے لیے مظاہر فطرت، عقل اور اخلاقی قانون سب ایک الوہی تخلیق کار کے باہم موافقت رکھنے والے مظاہر تھے۔'' (ص ۴۴۱)

ملاحظہ فرمایئے! عالمی سطح پر مسلم دشمن بلکہ انسانیت دشمن بدنام زمانہ تنظیم کے گرینڈ ماسٹر کو سچا مجاہد بنا کر پیش کرنے والے ''فہم دین'' اور ''تفہیم شریعت'' کے داعیوں کے متعلق اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ بھی ''مظاہر فطرت، عقل اور اخلاقی قانون کے الوہی تخلیق کار کے باہم موافقت رکھنے والے مظاہر'' میں سے ہیں تو کیا یہ غلط گمان ہوگا؟

راقم جب مصر گیا تو نہر سویز دیکھنے کے لیے پاپڑ بیل کر پہنچ ہی گیا۔ غرض فقط اتنی ہی تھی کہ وہاں کھڑے ہو کر امرؤ القیس کے دوستوں کی طرح دو آنسو بہائے۔ شاید ہمارے اجتماعی گناہوں کو دھو ڈالیں۔ نہ پوچھیے، حسرت اور کرب کا کیا عالم تھا؟ بات صرف اتنی نہ تھی کہ دنیا کی یہ معاشی شہ رگ ایک مسلمان ملک میں ہوتے ہوئے غیر مسلموں کے قبضے میں ہے۔ دکھ اس کا تھا کہ یہ درحقیقت امریکا، برطانیہ، فرانس کے قبضے میں نہیں، قوم یہود کے قبضے میں ہے۔ ہماری غامدی برادری کے ممدوح سچے مجاہد کی اس داستان سے اس کا بھی ثبوت مل گیا کہ اس نہر کی تعمیر میں ایک مخصوص برادری بھی شریک تھی جو الجزائر سے لاہور تک ایجنٹ تلاش کرتی رہتی ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جیسے سمجھنے کے لیے چور کے ہاتھ میں دھرے چراغ کی روشنی اسے پہچاننے کا کام دے رہی ہے۔

''سترہ نومبر ۱۸۶۹ء کو جب نہر سویز کھولنے کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تو امیر کو بھی گرینڈ پویلین میں نپولین کی بیوی، ملکہ یوجینن، آرچ ڈیوک وکٹر آف آسٹریا، شاہ ہنگری اور ساری دنیا سے آئے ہوئے سفیروں اور اہم شخصیات کے ساتھ بٹھایا گیا۔...... مشرق اور مغرب کے سمندروں کو آپس میں ملانے کا خواب پورا کرنے میں عبدالقادر نے فرانس کے فردیناں دے لیسپس (Ferdinand de Lesseps) کی کچھ کم مدد نہیں کی تھی۔...... امیر کے یہ کردار ادا کرنے پر آمادہ ہونے کی بہت سی وجوہات تھیں۔...... لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نہر سویز کی تشہیر کرنے والوں میں بھائی چارے کا احساس نظر آتا تھا۔ ان میں بہت سے مقدس سائمن کے پیروکار اور میسونی تھے جن کے مقامی لاج کے طرف سے لہرائے جانے والے بینرز پر ''پرخلوص دوستی''، ''پیار اور سچائی'' اور ''سمندروں کا اتحاد'' جیسے الفاظ درج تھے۔...... تقریب میں دوستی اور تمام لوگوں کے مابین بھائی چارے کے گیت گائے گئے۔ یہ مقدس سائمن کے اور میسونی نظریات تھے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان پل تعمیر کرنے اور یورپی مادہ پرستی کو اسلام کی روحانیت سے

متوازن کرنے کی عبدالقادر اپنی خواہش سے مکمل مطابقت رکھتے تھے۔ ممکن ہے چار سال پہلے پیرس کا دورہ کرتے ہوئے میسونی لاج ''ہنری چہارم'' میں باقاعدہ شمولیت اختیار کرنے کی بڑی وجہ یہی رہی ہو۔'' (ص ۴۴۲، ۴۴۴)

عالمی میڈیا امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد بارک اللہ فی حیاتہ کو امیر کہنا پسند نہیں کرتا، لیکن امیر عبدالقادر کی کتابیں جن کا ترجمہ نگار اپنا نام نسب ظاہر کرنے سے شرماتا ہے، کی کتابیں شائع کر کے سستے داموں پھیلاتا ہے؟ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ملا عمر مجاہد نے آخری دم تک دشمنوں کے آگے سر نہ جھکایا، جبکہ الجزائری امیر نے تو اپنی مہر میں بھی یہودی نشان بنا رکھا تھا۔ مذکورہ کتاب کے پشتی سرورق پر اس مہر کا نقش موجود ہے جس میں چھ کونوں والا ستارہ پکار پکار کر تحریک غامدیت پر مہر یہودیت ثبت کر رہا ہے۔ کتاب کے ص ۲۸۵ کے حاشیے پر لکھا ہے:

''امیر کی مہر دو مثلثوں پر مشتمل تھی جن میں ایک سیدھی اور دوسری معکوس تھی۔ دونوں مثلثیں ایک دوسرے کے اوپر تھیں جس سے چھ کونوں والے ستارے کی شکل بن جاتی تھی۔ ان کے اردگرد ایک دائرہ تھا۔ اوپر کی طرف نوک والی مثلث روحانی طاقت کی علامت تھی جب کہ نیچے کی طرف نوک والی مثلث دنیاوی اقتدار کی نمائندگی کرتی تھی۔ دائرہ الوہی رحمت کی علامت تھا۔''

جب فری میسنری کی غلامی قبول کر لی گئی تو یہودی سرمایہ دار ایسے شخص کی حمایت سے کیوں پیچھے رہتے؟ مشہور زمانہ یہودی خاندان ''روتھ شیلڈ'' ہمارے ممدوح مجاہد کی مدد کو آ گیا۔ سنیے اور سر دھنیے: ''وقت گزرنے کے ساتھ فرانسیسی حکومت کی مدد سے عبدالقادر نے زرعی زمینیں حاصل کر لیں تا کہ اپنے الجزائری لوگوں کی مدد کے لیے پیسے کمائے جائیں۔ پھر ایک وقت آیا جب وہ اتنی بڑی زرعی جاگیر کا مالک بن گیا جو مغرب میں بحیرہ طبریہ (Sea of Galilee) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دمشق اور بیروت کے درمیان پل تعمیر کرایا اور جیمز روتھ شیلڈ کی شراکت سے محصول چونگی بھی قائم کی۔'' (ص ۴۰۶)

کتاب کے عالمانہ تعارف میں اس کی اشاعت کی ایک اور غرض بھی بیان کی گئی ہے: ''ایسی شخصیات کے ساتھ نئی نسل کا تعارف اور ان کے کردار اور افکار و تعلیمات سے آگاہی استعماری تسلط اور یلغار کے آج کے تازہ عالمی منظر میں مسلم امہ کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ ہے اور اس سمت میں کوئی بھی مثبت پیش رفت ہمارے لیے ملی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔'' (ص ۱۱)

آیئے دیکھتے ہیں وہ کون سا کردار ہے جو آج کے تازہ عالمی منظر میں مسلم امہ کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہے؟ اور فحاشی و بے حیائی کی اس سمت میں ہم مثبت پیش رفت کریں تو کس اہم ملی ضرورت کو پورا کر سکیں گے؟ اس حوالے سے اس کتاب کی چند عبارتیں بلا تبصرہ پیش خدمت ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ ہم میں فقط امریکہ نظریہ جہاد سے ہی متعارف نہیں کروایا جا رہا، بلکہ ہماری نئی نسل کو شہوت پرستی، نسوانیت پرستی اور زنخا پرستی میں بے دریغ دھکیلا جا رہا ہے۔ سچے مجاہد کی حد سے بڑھی ہوئی شہوت پرستی کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''ایسا لگتا تھا کہ اپنی ذات کی سختی سے نفی کرنے والے عبدالقادر کی زندگی میں واحد استثنا عورت تھی اور اس کا مسلسل وسیع ہوتا ہوا حرم سفارت کاروں کے لیے تھوڑے بہت نہیں بلکہ شدید حسد کا باعث تھا۔'' (ص ۳۹۱)

مسلسل وسیع ہونے والے حرم کا اندرونی حال بھی سن لیجیے: ''اسے ایک بار امیر کے حرم کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملا۔ یہ

افواہ گرم تھی کہ امیر ہر سال نئی شادی کرتا ہے جو عموماً سرکیشیائی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جین کی رپورٹ یہ تھی کہ اگر اس نے ان میں سے بیشتر کو طلاق دے کر رخصت نہیں کر دیا تو پھر یہ افواہ غلط ہے۔ اسے وہاں صرف پانچ بیویاں نظر آئی تھیں*، لیکن یہ تعداد بھی اسلامی شریعت میں دی گئی اجازت کی حد سے ایک زیادہ بنتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی بیوی خیرا کے بارے میں، جس کی امیر سب سے زیادہ قدر کرتا تھا، جین کا کہنا تھا کہ ''انتہائی موٹی اور جسمانی طور پر بدصورت تھی، لیکن وہ پورے وقار اور پرسکون تحکم کے ساتھ حرم کی سربراہی کرتی تھی۔'' (ص ۴۵۱)

کوئی کہہ سکتا ہے کہ پانچویں عورت بیوی نہیں، لونڈی ہوگی، لیکن اس کا کیا کریں کہ ایسی عورتوں سے تعلقات کے ثبوت بھی اس سچی داستان میں موجود ہیں جو انگلستان جیسے مادر پدر آزاد ماحول میں بھی بدنام تھیں: ''عبدالقادر برطانیہ کی دو ایسی شخصیات کا دوست اور معترف تھا جو اپنی ثقافت سے باغی تھیں۔ ایک وہ آزاد خیال روایت شکن جس نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں تعاون کیا اور جس کے پسندیدہ موضوعات میں پرشہوت عورتیں، جسم فروشی اور زنخا بنانے کے طریقے شامل تھے، جب کہ دوسری شخصیت اخلاق باختہ سمجھی جانے والی ایک خود پسند اور بدنام عورت تھی جس نے اپنی جنسی مہم جوئی کے لیے اپنا بچہ تک چھوڑ دیا۔'' (ص ۴۵۲)

جنسی مہم جوئی کے لیے اپنا سگا بچہ چھوڑنے والی ہمارے سچے مجاہد صاحب سے کیا تعلق رکھتی تھی اور ان کے ڈیرے پر باقاعدگی سے کس لیے حاضری دیتی تھی؟ ملاحظہ فرمائیں: ''جین ڈھلتی ہوئی عمر کے عبدالقادر کی بھی منظور نظر بن گئی تھی جس نے احتیاط سے خضاب لگی ہوئی سیاہ داڑھی کے ساتھ اپنی جوانی کا تاثر قائم رکھا ہوا تھا۔ جین باقاعدگی سے نقیب ایلی آنے والے مہمانوں میں شامل تھی اور گرمیوں میں اکثر ان مہمانوں میں شامل ہوتی تھی جو امیر کی رہائش گاہ پر دریائے برادا کا نظارہ کرتے ہوئے پودینے کی چائے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جین نے اپنے شوہر مید جوئیل المرزگ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ سال میں چھ ماہ یورپی طرز کے مطابق زندگی بسر کرے گی۔..... مید جوئل المرزگ کے ساتھ شادی نے ڈگبی جین کی اس دھماکہ خیز رومانی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس نے اسے سارے انگلینڈ میں بدنام کر رکھا تھا۔'' (ص ۴۴۹، ۴۵۰)

اس کتاب کے ذریعے ہمیں کون سے اسلام اور کس طرح کی شریعت اپنانے کی ترغیب دی جا رہی ہے، اس کا کچھ اندازہ ذیل کی عبارت سے ہو جاتا ہے: ''امیر کے پاس تو صرف ایک ہی سمت نما تھا اور وہ تھا اسلام۔ تنگ نظری پر مبنی فرقہ وارانہ اسلام نہیں بلکہ اس سے کہیں وسیع تر اسلام، فطرت کا اسلام، ہر اس جاندار کا اسلام جو خدا کے قانون کے آگے سر جھکا دے۔ امیر کا اسلام ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا تھا جو ''عظیم تر'' تھا، جو اس کے حقیر بندوں اور اسلام سمیت اس کے کسی بھی مذہب کے تصور سے بھی عظیم تھا۔ ''ہر شخص اسے اپنے مخصوص انداز میں جانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے اور وہ دوسرے طریقوں سے مکمل طور پر لاعلم رہتا ہے۔'' دوسرے لفظوں میں ہم سب غلط ہیں۔ اب عبدالقادر کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ خدا کی وحدانیت کو ان طریقوں کے تنوع کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے جن سے اس کے پیدا کیے ہوئے بندے اس کی عبادت کرتے ہیں۔'' (ص ۳۷۶)

اب ہم ایک آخری حوالہ نقل کر کے رخصت چاہیں گے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے ذریعے ہمیں اسلام کی جو تعبیر اور قرآن کی جو تشریح سکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ ''برادری'' کا پرانا حربہ ہے۔ خدا ان لوگوں کو ہدایت

دے جوایسے لوگوں کے آلہ کار بن کر اپنا نام چھپاتے اور کارنامے گنواتے پھرتے ہیں: ''۱۸۶۰ء کے موسم خزاں میں پیرس میں سولہ صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ گردش کر رہا تھا جس کا عنوان تھا: ''عبدالقادر، عرب شہنشاہ''۔ اس کتابچے میں لکھا تھا کہ عظیم تر شام کے تخت پر بٹھانے کے لیے عربوں کو حقیقی صلاحیتوں کا مالک ایک رہنما چاہیے اور اس کے لیے عبدالقادر کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ اس تحریر کے مطابق عبدالقادر مغرب اور مسلمانوں کو یہ سکھائے گا کہ ''قرآن کے الفاظ کی صحیح تشریح کیا ہے اور ایک سچے مومن کو ان کی تعبیر کس طرح کرنی چاہیے۔'' (ص ۴۳۵)

جھوٹے مجاہد کے جعلی ترجمان

''امیر عبدالقادر الجزائری'' کے حالات پر مشتمل جان ڈبلیو کائزر کی کتاب کا ترجمہ ''دارالکتاب'' لاہور کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ ''دارالکتاب'' لاہور علمائے دیوبند کی فکری کا وارث ہے اور انقلابی جہادی تحریکوں سے متعلق کتابیں شائع کرتا ہے، لہٰذا یہ بات ہمارے لیے ناقابل یقین تھی کہ انقلابی مجاہدین کے جہادی کارناموں کو عام کرنے والا ادارہ ایک ایسی کتاب کیسے شائع کر سکتا ہے جو جہادی تحریکات کا تمسخر اڑاتی ہو، مجاہدین کو دہشت گرد اور مسلمانوں کو خونی درندے ثابت کرتی ہو۔ لہٰذا ہم نے اس بات کی تحقیق ضروری سمجھی کہ جہاد کی مخالفت کرنے والی اور مجاہدین کو دشمن انسان اور دشمن انسانیت اور دشمن رحمت و رافت ثابت کرنے والی کتاب کس نے شائع کروائی۔

اس سلسلے میں ۱۹/اپریل بروز جمعہ دن ۱۱ بجے دارالکتاب کے مالک سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے ہمارے ایک مہربان بزرگ جناب خالد جامعی صاحب کو یہ بتایا کہ امیر عبدالقادر الجزائری والی کتاب پر ان کے ادارے کا نام تو ضرور ہے، لیکن وہ نہ تو اس کتاب کے ناشر ہیں اور نہ ہی انھیں اس بات کا علم ہے کہ ترجمہ کس نے کیا، نیز شائع کرنے والوں کے مقاصد کیا ہیں؟ ان سے جب گفتگو کی تفصیلات معلوم کی گئیں تو انھوں نے بتایا کہ یہ کتاب عمار خان ناصر صاحب نے شائع کروائی اور ہمیں فون پر اطلاع دے دی کہ یہ کتاب ہم نے آپ کے نام پر شائع کروائی ہے۔ بالکل اسی طرح عمار خان ناصر کی کتاب ''براہین'' بھی جبراً شائع ہوئی۔ کتاب عمار ناصر نے خود چھپوائی اور اس پر ہمارا نام شائع کروا دیا۔

ہمارے ایک اور دوست نے بتایا کہ امیر عبدالقادر والی کتاب کی تعارفی تقریب لاہور کے ایک ہوٹل میں منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی امریکی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری تھے۔ نظامت کے فرائض عمار خان ناصر انجام دے رہے تھے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کتاب پر تبصرہ سے پہلے کتاب کی اشاعت و طباعت و ترسیل و تقسیم کی طلسماتی کہانی خود ہی اس کتاب کی حقیقت، ماہیت، حیثیت، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کو بتانے کے لیے کافی اور شافی ہے۔

کتاب کے سرورق کی پشت پر ایک ویب سائٹ کا نام دیا گیا ہے: www.truejihad.com۔ اس ویب سائٹ کا نام ہی مغرب کے مقاصد، اہداف، ارادوں اور عزائم کی ترجمانی کرتا ہے۔ جہاد تو جہاد ہوتا ہے۔ True Jihad کیا ہوتا ہے؟ عصر حاضر میں جب بھی کوئی یہ کہے کہ ''حقیقی اسلام، حقیقی جہاد، حقیقی فقہ، حقیقی اجتہاد'' تو اس کا مطلب صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ غیر حقیقی اسلام، غیر حقیقی جہاد، ایسا اسلام اور ایسا جہاد جو صرف اور صرف مغرب کے استعماری غلبے، عالمی تسلط اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو ممکن بنا سکے۔

بروز جمعہ ۱۹/اپریل ۲۰۱۳ء کو ۱۱:۳۰ بجے ہم نے truejihad نامی ویب سائٹ کا مطالعہ کیا تو اس ویب سائٹ

سے ہمیں دو مضامین میسر آئے۔

(۱) Some words about true and false jihad جو A4 سائز کے بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) The Abd el-Kader Education project 2011 in Review جو A4 سائز کے 7 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے مطالعہ کے بغیر اس کتاب کی حقیقت آشکار نہیں ہو سکتی۔

عبد القادر ایجوکیشن پراجیکٹ کا تعارف کراتے ہوئے اس پروجیکٹ کے پس منظر کے بارے میں درج ذیل معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ ان معلومات پر کسی قسم کے تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں۔

امیر عبد القادر الجزائری کی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں Iowa سینٹر) امریکہ کے شہر Iowa City میں قائم کیا گیا۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ مجاہد عالم اسلام کا ہے اور اس کی تقدیس، تکریم، تحسین اور تشہیر امریکا والے کر رہے ہیں۔ این چہ بوالعجبی است؟

امیر عبد القادر کی یاد منانے کے لیے ''القادر اوپیرا ہاؤس'' میں مقررین خطاب فرماتے ہیں اور اس کے بعد روایتی مغربی تفریحات کا اہتمام ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ پر ایک اور ویب سائٹ www.abdelkaderproject.org موجود ہے۔ اس ویب سائٹ کا مقصد دنیا کے تمام تعلیمی اداروں کو امیر عبد القادر کے بارے میں معلومات اور نصابی مواد مہیا کرنا ہے تاکہ اسکول میں امیر عبد القادر نصاب کا حصہ بن جائے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے:

Provides learning tools & curriculam materials to help educators in corporate abdel-kader's stay & his example in the days's calm zoom.

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی مجاہد یا عظیم ہستی کو اپنے اسکول یا مدرسے کے ہر طالب علم کو واقف کرانا پسند کریں تو دو مجاہدوں کو کسی قیمت پر فراموش نہیں کر سکتا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ایسے مجاہدین تھے جن کے صرف اسلام پر ہی نہیں، پوری تاریخ انسانیت پر بے شمار احسانات ہیں۔ مغرب نے ان دو سپہ سالاروں کو منتخب کرنے اور ان کی تعلیمات اور طرز زندگی کو طلبہ تک پہنچانے کے بجائے امیر عبد القادر کا انتخاب کیوں کیا؟ یہ بہت سادہ سا مسئلہ ہے۔

امریکا کے Iowa شہر کے اور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو Elkader کے نام سے موسوم ہے۔

آخر امریکی جو مسلمانوں پر آگ اور خون کی بارش برسانے میں سب سے آگے ہیں، ایک مسلمان کو اتنی عزت دینے پر کیوں مجبور ہو گئے؟ اس فراخ دلی کا راز ہر صاحب عقل پر آشکارا ہے۔ امیر عبد القادر الجزائری جس قسم کے مجاہد تھے، امریکا اور اس کے مغربی حمایتی اسی قسم کے کرزئی مجاہدین کو آگے لانا چاہتے ہیں جنھیں جب چاہیں، ماڈرن اسلام اور ماڈرن جہاد کے مثالی نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد حفظہ اللہ اور شہید المومنین شیخ اسامہ بن لادن رحمہ اللہ جیسی صاحب عزیمت و استقامت شخصیات، مجاہدین کے آئیڈیل بن سکیں۔ مغرب کی اس ذہنیت کے تناظر میں ان حضرت کے ذہنی و نظریاتی رشتوں کو بھی سمجھا جا سکتا ہے جو اس قسم کی کتابیں شائع کرا کر ہمارے یہاں ''سچے جہاد'' کی اشاعت چاہتے ہیں۔ (بشکریہ ہفت روزہ ''ضرب مومن'' کراچی)

محمد عمار خان ناصر

الجزائری کی داستان حیات: چند توضیحات

کوئی دو سال قبل مجھے امریکی مصنف جان کائزر کی ایک کتاب کے توسط سے انیسویں صدی میں فرانس کی استعماری طاقت کے خلاف الجزائر میں جذبہ حریت بیدار کرنے اور کم وبیش دو دہائیوں تک میدان کارزار میں عملاً داد شجاعت دینے والی عظیم شخصیت، امیر عبد القادر الجزائری کی شخصیت سے تفصیلی تعارف کا موقع ملا تو فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی داستان حیات اور خاص طور پر ان کے تصور جہاد سے پاکستان کی نئی نسل کو بھی آگاہی پہنچانی چاہیے تاکہ ہمارے ہاں شرعی جہاد کا مسخ شدہ اور شرعی اصولوں کے بجائے ہمارے اخلاقی، تہذیبی اور نفسیاتی زوال کی عکاسی کرنے والا جو تصور پروان چڑھ رہا ہے، اس کا کسی حد تک مداوا ہو سکے اور ماضی قریب کی تاریخ سے ایک ایسا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جس سے ہم عزم وہمت اور جرات وحوصلہ کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی، معروضیت اور بلند اخلاقی کا سبق بھی سیکھ سکیں۔ اس ضمن میں، مجھے ابتدا ہی سے اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ امیر الجزائری کی شخصیت اور طرز جدوجہد سے حکمت وفراست اور اخلاقی اصولوں کی پاس داری کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، ہمارے ہاں کا جہادی ذہن یقیناً اس سے بدکے گا اور ردعمل میں لازماً اس انداز کی کوششیں ہوں گی کہ اپنے پسندیدہ جہادی ہیروؤں کے مقابلے میں امیر کی شخصیت کی قدر و قیمت کو گھٹایا اور ان کی ذات کو دینی واخلاقی لحاظ سے مجروح کیا جا سکے۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا ہے اور کراچی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار ''ضرب مومن'' کے ایک حالیہ شمارے میں مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب نے امیر عبد القادر الجزائری کی شخصیت اور ان کی داستان حیات سے متعلق جان کائزر کی کتاب کے اردو ترجمے کی پاکستان میں اشاعت کے حوالے سے، جس میں راقم الحروف کی سعی وکاوش بھی شامل رہی ہے، اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مفتی صاحب نے اس حوالے سے بعض ''خفیہ حقائق'' سے قارئین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے جو وضاحت کا تقاضا کرتے ہیں، اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سے متعلق اپنی مختصر معروضات قارئین کے سامنے پیش کر دوں۔

پہلی بات کتاب کے اردو ترجمے کی اشاعت کے لیے لاہور کے معروف اشاعتی ادارے ''دار الکتاب'' کا نام استعمال کرنے سے متعلق ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا ہے کہ راقم الحروف نے جان کائزر کی کتاب ''امیر عبد القادر الجزائری'' اور اس کے علاوہ اپنے مقالات کا مجموعہ ''براہین'' دار الکتاب کے مالکان سے اجازت لیے بلکہ انھیں پیشگی

اطلاع دیے بغیر ''جبراً'' ان کے نام سے شائع کی ہیں۔ یہ بات خلاف واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ بدیہی طور پر مضحکہ خیز بھی ہے، کیونکہ اول تو ایک جانے پہچانے اور معروف ادارے کے ساتھ اس طرح کا کوئی ''ہاتھ'' کرنا ممکن ہی نہیں اور فرض کریں کہ ایسا کیا جائے تو بھی کتاب کی اشاعت کے بعد وہ ادارہ حقیقت حال کی وضاحت کرنے اور قانونی چارہ جوئی کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دار الکتاب کے مالک حافظ محمد ندیم صاحب کے ساتھ کافی عرصے سے راقم کے ذاتی مراسم کے علاوہ اشاعتی کاموں میں باہمی تعاون کا تعلق بھی ہے اور اس سے قبل بھی ہم ۲۰۰۷ء میں دینی مدارس کے نظام تعلیم سے متعلق دو کتابیں الشریعہ اکادمی اور دار الکتاب کے مشترکہ اہتمام میں شائع کر چکے ہیں، جبکہ اسی نوعیت کے دوسرے منصوبوں پر بھی مشورہ اور گفت وشنید کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ''الجزائری'' اور ''براہین''، دونوں کی اشاعت کے ضمن میں حافظ محمد ندیم صاحب کو پوری طرح اعتماد میں لیا گیا تھا اور ان کی پیشگی اجازت کے بعد ہی یہ کتابیں دار الکتاب کے نام سے شائع کی گئی تھیں اور اشاعت کے بعد سے اب تک دار الکتاب کے واسطے سے مسلسل قارئین تک پہنچ رہی ہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ چونکہ مذکورہ کتب اور خاص طور پر ''براہین'' کی اشاعت اصلاً دار الکتاب کی تجویز نہیں تھی، اس لیے ان کے مندرجات سے ان کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔ دار الکتاب نے ان کتب کو شائع کرنے کی اجازت اتفاق رائے کے اصول پر نہیں، بلکہ دوستانہ مراسم کے تناظر میں رواداری کے اصول پر دی تھی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جو حضرات ان معروضات کی تصدیق کرنا چاہیں، وہ حافظ ندیم صاحب سے ان کے فون نمبر 0300-8099774 پر براہ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔

مفتی صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میری دلچسپی اور سعی وکاوش کو اس انداز سے آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے جیسے انھوں نے کوئی انتہائی خفیہ ''سازش'' گہری صحافیانہ تحقیق کے بعد دریافت کی ہو، حالانکہ میں اس کتاب کے مصنف جان کائزر کے ساتھ رابطے، کتاب کے انگریزی متن پر نظر ثانی، اردو ترجمے کی ترتیب وتدوین اور پھر اس کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی دلچسپی اور کوششوں کی پوری تفصیل خود اپنے قلم سے ماہنامہ الشریعہ کے مارچ ۲۰۱۲ء کے شمارے میں لکھ چکا ہوں۔ مجھے جان کائزر کی کتاب سے امیر عبد القادر کی شخصیت کے متعلق پہلی مرتبہ علم ہوا اور میں نے ان کی داستان حیات سے اردو قارئین کو واقفیت بہم پہنچانے میں دلچسپی محسوس کی اور اس کے لیے بساط بھر جو کچھ کر سکا، کیا۔ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور علانیہ بات ہے جس میں نہ سازش کا کوئی پہلو ہے اور نہ خفیہ منصوبہ بندی کا۔

مفتی صاحب نے لاہور کے ایک ہوٹل میں منعقد ہونے والی تقریب کا ذکر بھی کیا ہے جس میں امریکی سفارت خانے کے ایک عہدے دار شریک ہوئے تھے۔ اس ضمن میں بھی بعض معلومات کی تصحیح ضروری ہے۔ یہ تقریب جان کائزر کی کتاب کے تعارف کے حوالے سے نہیں، بلکہ اس کی اشاعت سے بہت پہلے امیر عبد القادر کی شخصیت کے تعارف کے حوالے سے میزونٹ ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کا اہتمام جناب عبد القدیر خاموش نے کیا تھا جو ''مسلم کرسچین انٹرفیتھ ڈائیلاگ'' کے زیر عنوان بین المذاہب افہام وتفہیم کے حوالے سے اس طرح کی تقاریب منعقد کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس تقریب میں نظامت کی ذمہ داری انجام نہیں دی تھی، بلکہ محض امیر کی شخصیت کے حوالے سے ایک لیکچر دیا تھا۔ امریکی سفارت خانے کے ایک عہدے دار (جن کا نام اور منصب مجھے بالکل یاد نہیں) اس میں مہمان خصوصی نہیں تھے، بلکہ

مختصر دورانیے کے لیے شریک ہوئے تھے۔ جہاں تک اس طرح کی تقاریب میں شرکت کا تعلق ہے تو تحفظاتی ذہن رکھنے والے حضرات یقیناً اس پر معترض ہو سکتے ہیں اور اس کے ڈانڈے یہود و ہنود کی خفیہ سازشوں سے بھی جوڑ سکتے ہیں، لیکن ایسی تقاریب جن کا موضوع سخن مختلف مذاہب کی باہمی دلچسپی سے تعلق رکھتا ہو اور خاص طور پر ان کا مقصد اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو، ان میں غیر ملکی حکومتوں کے نمائندوں کی شرکت کسی بھی طرح کوئی ناقابل فہم بات نہیں، بلکہ اس نوعیت کی تقریبات میں ہمارے ہاں کا عام معمول ہے۔ اس زاویہ نظر سے کم از کم میں ایسی تقریبات میں شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا اور نہ اس پر کسی قسم کی معذرت خواہی یا صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

مفتی صاحب نے امیر عبد القادر کی شخصیت کے بارے میں بھی اپنے منفی تاثرات کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان کے اس منفی تاثر کی بنیاد امیر عبد القادر کا ''شکست خوردہ'' جہاد ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امیر عبد القادر نے کم و بیش سولہ سال تک فرانسیسی استعمار کے خلاف میدان کارزار میں سرگرم رہنے کے بعد جب یہ دیکھا کہ پوری الجزائری قوم رفتہ رفتہ فرانسیسی کیمپ کا حصہ بن چکی ہے اور ان کے ساتھ بس چند سو کی تعداد پر مشتمل جاں نثار ساتھیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت رہ گئی ہے تو انھوں نے اپنی جماعت کو اس بے حاصل کشمکش کی نذر کرنے کے بجائے فرانس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی جماعت کو بحفاظت جلا وطن کر دیے جانے کی شرط پر فرانس کے ساتھ مصالحت کر لی۔ امیر کی اس حکمت عملی سے اختلاف کرنے والے اختلاف کر سکتے ہیں اور ہر قیمت پر لڑتے رہنے کو ''عزیمت'' کا عنوان دے کر جہاد کی آئیڈیل صورت بھی قرار دے سکتے ہیں، لیکن یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اسلامی تاریخ میں اس طرز عمل کے نمونے بھی موجود ہیں جو امیر الجزائری نے اختیار کیا۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک جنگ میں پے در پے شکست سے دوچار ہونے کے بعد جب اپنے ساتھیوں کو بحفاظت میدان جنگ سے نکال کر واپس مدینہ منورہ لے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی تھی۔ خود ہمارے ہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد بعض اکابر نے جلا وطنی اختیار کر لی تھی اور دوسروں نے جنگ سے کنارہ کش ہو کر تعلیم و تدریس کے میدان کا انتخاب کر لیا تھا اور اس کے بعد سے، تحریک ریشمی رومال کے استثنا کے ساتھ، دیوبندی تحریک نے بالعموم انگریزی حکومت کے ساتھ تصادم کے بجائے پرامن سیاسی جدوجہد کا طریقہ ہی اختیار کیے رکھا ہے۔

یہ معروضی صورت حال میں مناسب حکمت عملی کے انتخاب کا مسئلہ ہے جس میں وہی فریق بہتر فیصلہ کر سکتا ہے جو اُس صورت حال میں کھڑا ہو۔ یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ اس پر مطعون کرتے ہوئے امیر عبد القادر کو نہ صرف ''یہود کا گماشتہ'' قرار دے دیا جائے، بلکہ ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی بے بنیاد الزامات عائد کرنے کی کوشش کی جائے۔

مفتی صاحب کی طرف سے امیر کو ''یہود کا گماشتہ'' قرار دینے کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ انھوں نے ایک دور میں فری میسن تنظیم کی رکنیت قبول کر لی تھی۔ یہ بات درست ہے اور کوئی ڈھکی چھپی نہیں، بلکہ معلوم و معروف بات ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ امیر نے یہ رکنیت جس حسن تاثر اور جس اعلیٰ جذبے کے تحت قبول کی تھی، بعد میں اس کے حوالے سے عدم اطمینان ہونے پر انھوں نے اس سے علیحدگی بھی اختیار کر لی تھی۔ افسوس ہے کہ مفتی صاحب نے جان کائزر کی کتاب سے وہ اقتباسات تو نقل کر دیے ہیں جو فری میسن سے وابستگی کی تفصیلات بتاتے ہیں، لیکن انھی

صفحات پر موجود یہ اطلاع انھوں نے کمالِ دیانت سے حذف کر دی ہے کہ انھوں نے اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ پھر یہ کہ فری میسن سے وابستگی ان کی زندگی کے آخری دور میں دمشق کے قیام کے دوران کا واقعہ ہے، جبکہ فرانس کے خلاف جہاد اور پھر صلح کے معاملات اس سے کئی دہائیاں پہلے گزر چکے تھے جب امیر کو فری میسن کے بارے میں سرے سے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ اس لیے جہاد سے دست برداری کے معاملے میں ان کے طرز عمل کو ان کے ''یہودی گماشتہ'' ہونے سے وابستہ کرنا کسی بھی منطق کی رو سے درست نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب نے امیر عبد القادر کو 'ماڈرن جہاد' کا نمائندہ ثابت کرنے کے لیے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ ان کی تعریف وتوصیف میں اہل مغرب رطب اللسان ہیں، ان کے نام پر امریکہ کی ریاست Iowa میں ایک قصبے کو موسوم کیا گیا ہے اور وہاں کے پبلک اسکولوں میں طلبہ کو امیر کی شخصیت سے واقف کرانے کے لیے ایک مستقل تعلیمی پروگرام چل رہا ہے۔ مفتی صاحب کا سوال یہ ہے کہ آخر ایک ''سچے مجاہد'' کے ساتھ اہل مغرب اس طرح کا تعلق خاطر کیونکر رکھ سکتے ہیں؟

یہ سوال اہل مغرب کے ہاں امیر کی مقبولیت کے اصل پس منظر کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اہل مغرب کے ہاں امیر کی تکریم وتعظیم کا سبب ان کا ''مجاہد'' ہونا نہیں، بلکہ ایک تو ان کا وہ اخلاقی طرز عمل ہے جو انھوں نے فرانسیسی قیدیوں کی دیکھ بھال اور ان کے جسمانی ومذہبی حقوق کے احترام کے حوالے سے اختیار کیا اور دوسرا بلکہ اصلی سبب ان کا اور ان کے ساتھیوں کا وہ جرات مندانہ کردار ہے جو انھوں نے ۱۸۶۰ء میں دمشق میں مسلم مسیحی فسادات کے موقع پر بے گناہ مسیحیوں کو مسلمانوں کے مشتعل ہجوم سے، جو ان سب کو تہہ تیغ کر دینا چاہتا تھا، بچانے کے لیے ادا کیا تھا۔ درحقیقت امیر کا یہی وہ کردار ہے جس نے اس وقت کے نمایاں ترین مغربی قائدین اور اخبارات وجرائد کو ان کی تعریف میں یک زبان کر دیا اور انھیں مغرب میں اعلیٰ مذہبی اخلاقیات کے ایک مجسم نمونے کے طور پر جانا جانے لگا۔ امریکہ کی ریاست Iowa میں ایک قصبے کو ان کے نام پر موسوم کرنے اور طلبہ کو ان کی شخصیت سے متعارف کرانے کا پس منظر یہی ہے۔ میرے نزدیک اس پہلو سے امیر کی شخصیت نہ صرف آج کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے، بلکہ اہل مغرب کے سامنے اسلام کے تصور جہاد کے درست تعارف کے لیے بھی ایک گراں قدر اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم دعوتی ذہن کے تحت ان جیسی شخصیت کی قدر وقیمت محسوس کرنے کے بجائے نفسیاتی شدت احساس کے زیر اثر انھیں مجروح کرنے اور ان کے مقابلے میں فکری واخلاقی بونوں کا امیج بلند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب نے امیر الجزائری پر ''حد سے بڑھی ہوئی شہوت پرستی'' کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ یہاں بھی، افسوس ہے کہ انھوں نے سخت غیر اخلاقی طرز عمل اختیار کیا ہے۔ انھوں نے جان کائزر کی کتاب سے امیر سے میل ملاقات رکھنے والی ایک مغربی خاتون جین ڈگبی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ امیر کے حرم میں پانچ بیویاں تھیں، لیکن حاشیے میں مصنف کا یہ نوٹ نظر انداز کر دیا ہے کہ جین ڈگبی کی اس اطلاع کی کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی اور یہ کہ جین کا یہ بیان محض قیاس آرائی بھی ہو سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے مزید ستم یہ کیا ہے کہ خود جین ڈگبی کو، جو امیر کی مجلسوں میں شریک ہونے اور ان سے قریبی سماجی تعلقات رکھنے والے بہت سے مغربی افراد میں سے ایک تھی، امیر کے ساتھ ناجائز تعلقات میں ملوث دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ استنتاج ایک منفی زاویہ نظر سے بعض معلومات کو پڑھنے کا نتیجہ ہے یا اس

میں بالقصد اتہام طرازی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت حال جو بھی ہو، بہر حال یہ ایک نہایت افسوس ناک طرز تحریر ہے جسے میں کسی تردد کے بغیر سطحی اور پراپیگنڈا صحافت کا ایک نمونہ قرار دوں گا۔ قارئین، کتاب کے متعلقہ حصوں کے مطالعے سے خود معلوم کر سکتے ہیں کہ نہ تو مصنف کے پیش نظر امیر اور جین ڈگبی کے مابین ناجائز تعلقات کی نشان دہی ہے اور نہ درج کردہ معلومات سے استدلال کے کسی بھی اصول کے تحت یہ نتیجہ یا اس کی طرف کوئی اشارہ ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ فرض کریں، امیر کی زندگی میں اس قسم کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو تو بھی ایسی کسی بات کا زیر نظر کتاب میں درج ہونا خود مفتی صاحب کے مفروضے کی رو سے بھی ناقابل فہم ہے، کیونکہ اگر یہ کتاب کسی سازش کے تحت مسلمانوں میں ''جعلی'' مجاہد کو ''حقیقی'' اسلام کے نمائندے کے طور پر متعارف کروانے کے لیے لکھی گئی ہے تو اس کا مصنف اتنا بے وقوف تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں اخلاقیات کے تصور سے بالکل ناواقف ہو اور امیر کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو کتاب میں بیان کر دے جس سے کتاب کا سارا مقصد ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہو۔ انسان بعض دفعہ سازشی مفروضوں کے گھوڑے پر ایسا سوار ہوتا ہے کہ کامن سینس کو بھی پس پشت ڈال دیتا اور بالکل سامنے کی چیزوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ مفتی صاحب کو اس اتہام طرازی کے لیے روز قیامت کو اللہ تعالیٰ اور امیر عبد القادر کے سامنے جواب دہی نہ کرنی پڑے۔

آخری گزارش کے طور پر یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ کسی بھی شخص کے آرا وافکار یا حکمت عملی سے اختلاف کوئی ناپسندیدہ بات نہیں، لیکن اختلاف کا حسن یہی ہے کہ آپ اخلاقی اصولوں اور آداب اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے تنقید کریں۔ تحریر میں سطحی اور گمراہ کن ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے سنسنی کی فضا پیدا کر کے وقتی طور پر تو قارئین میں مقبولیت حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن اس طرز تحریر سے وجود میں آنے والے لٹریچر کی عمر اس دنیا میں بھی زیادہ نہیں ہوتی اور آخرت تو ہے ہی اسی لیے کہ وہ دنیا میں لوگوں کی نظروں میں 'مزین' کر دیے جانے والے اعمال کی قلعی کھول کر رکھ دے!!! اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الآخرۃ۔

مجلّہ ''صفدر'' گجرات کی طرف سے

مولانا مفتی عبد المجید دین پوری شہیدؒ

کی یاد میں خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اہل علم وقلم اپنے مضامین، تاثرات، تعزیتی پیغامات، اشعار یکم رجب تک ارسال فرما دیں۔

رابطہ: مولانا مفتی شعیب عالم

جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی

0321-3767912 / 0307-5687800

email: khadim.khan4@yahoo.com

مکاتیب

(۱)

۱۹/اپریل ۲۰۱۳ء

مکرمی ومحترمی جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزشتہ مہینے آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں میرے دفتر میں تشریف لائے اور مجھے ملاقات کی سعادت نصیب فرمائی۔ اس کے لیے میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ میرے لیے وہ دن یقیناً بے حد خوشی کا دن تھا۔ آپ سے ملاقات کے دو تین بعد آپ کی عنایت سے آپ کے چند کالم، ''الشریعہ'' اور ''نصرۃ العلوم'' کے تازہ شمارے بھی ملے جن کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ اور عزیزم محمد عمار خان ناصر کی تحریروں کا ایک مدت سے مداح ہوں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ دونوں کے خیالات میں جو توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے، وہ ہمارے مذہبی (اور دیگر حلقوں میں) آج کل ناپید ہے۔ تاہم پورے احترام اور عقیدت کے ساتھ میں ''نصرۃ العلوم'' کے مارچ ۲۰۱۳ء کے شمارے میں آپ کے قلم سے لکھے ہوئے اداریے کے بارے میں اپنی مایوسی اور شکایت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے معتدل مزاج عالم دین سے مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ آپ شیخ الازہر ڈاکٹر احمد الطیب کے اس متعصّبانہ بیان کی تائید کریں گے جو موصوف نے ایران کے صدر جناب محمد احمدی نژاد کے سامنے دیا۔ مجھے شیخ الازہر سے بھی ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ مہمان نوازی کی اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اپنے گھر آئے مہمان کو اس طرح ڈانٹ پلائیں گے جیسا کہ ان کے بیان سے عیاں ہے۔

اس سلسلے میں دو تین باتیں سامنے رکھنا ضروری ہے:

۱۔ شیخ الازہر کا یہ شکوہ کہ ایران خلیج کی ریاستوں اور خصوصاً ''برادر ہمسایہ عرب ملک'' بحرین کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے، صریحاً غلط بینی اور یک طرفہ فیصلے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، بحرین میں اہل تشیع کی اکثریت ہے اور اس کے باوجود انھیں نہ شہری حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی ووٹ دینے کا حق۔ گزشتہ دو سال سے وہاں شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کے لیے ایک تحریک چل رہی ہے۔ اس تحریک میں یقیناً اہل تشیع کی اکثریت ہے، لیکن اس میں بحرین کے جمہوریت پسند سنی بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ یہ تحریک پرامن تحریک تھی، لیکن اس کو کچلنے کے لیے جس بے رحمی سے فائرنگ کر کے درجنوں شیعوں کو ہلاک کیا گیا اور سینکڑوں لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا، حتیٰ کہ ان

ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا جنھوں نے زخمی مظاہرین کی مرہم پٹی کی تھی۔ یہ سب کچھ بین الاقوامی پریس میں اور خود ہمارے اخبارات میں مسلسل رپورٹ ہوتا رہا ہے۔ شیخ الازہر شکایت کرتے ہیں (اور آپ اس کی تائید کرتے ہیں) کہ ایران، بحرین کے داخلی امور میں مداخلت کر رہا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بحرین کے شاہی نظام کی حفاظت کے لیے ایران نے نہیں، بلکہ ''برادر عرب ملک'' نے اپنی فوج بھیجی تھی۔

۲۔ میرے علم کی حد تک حکومت ایران کی جانب سے نہ تو سنی ممالک میں شیعہ مذہب کو پھیلانے کی کوئی باقاعدہ کوشش ہو رہی ہے اور نہ ہی، جیسا کہ شیخ الازہر نے الزام لگایا ہے، ''اہل سنت کے مسلک کو گزند پہنچانے'' کی کوئی مہم چلائی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے فوراً بعد یقیناً ایران کی مذہبی قیادت میں مسلکی جوش وخروش کی فراوانی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس چیز کو اولیت حاصل ہے، وہ ایران کے قومی مفادات ہیں، مسلکی ترجیحات نہیں۔

''الامام الاکبر'' صاحب کو اتنی بات تو معلوم ہونی چاہیے کہ خطے میں گزشتہ تیس سال سے مختلف ملکوں کے درمیان اقتدار کی جو جنگ جاری ہے، اس میں دوسرے ملکوں کی طرح ایران بھی ایک اہم کردار ہے۔ مشرق وسطیٰ اور خلیج میں جو ملک آج برسر پیکار ہیں، وہ شیعہ اور سنی مسلک کے لیے نہیں، عراق، شام، لبنان اور مقبوضہ فلسطین میں اپنا اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اقتدار کی اس جنگ کو شیعہ سنی تنازعے سے تعبیر کرنا ایسا ہی ہے جیسے صدام حسین کا ۱۹۹۱ء میں یہ دعویٰ کہ وہ اہل عرب اور اہل سنت کی بالادستی کے لیے ایران پر حملہ آور ہوا تھا یا امریکہ کا دعویٰ کہ اس نے ۲۰۰۳ء میں جمہوریت کے فروغ کے لیے عراق پر حملہ کیا تھا۔ بلاشبہ ایران کی خارجہ پالیسی، دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح، تضادات کا مجموعہ ہے اور اس کی بنیادی وجہ ایران کے قومی مفادات ہیں جن کی ترجیحات حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ اخلاقیات، مسلک اور مذہبی رجحانات کی حیثیت خارجہ پالیسی میں اکثر وبیشتر ثانوی ہوتی ہے۔

۳۔ جہاں تک الازہر کے شیوخ کی علمی دیانت اور اسلامی Integrity کا تعلق ہے تو میرے خیال میں یہ بات جاننے کے لیے گوگل سرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ گزشتہ پچاس سال سے ان حضرات (الا ماشاء اللہ) صدر جمال عبد الناصر، انور سادات اور حسنی مبارک اور ان کی پالیسیوں کے حق میں کتنے فتوے دیے ہیں اور ہر آمر کی کن کن حیلوں سے ہاں میں ہاں ملائی ہے۔

۴۔ اداریے کے آخر میں آپ کا یہ ارشاد کہ ''شیخ الازہر آگے بڑھ کر اس مسئلہ پر عالم اسلام کے علمی حلقوں کی باہمی مشاورت کا بھی اہتمام کریں تاکہ اجتماعی طور پر اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل اختیار کیا جا سکے'' ایک نہایت خطرناک تجویز ہے جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لیا جا سکتا کہ شیعوں کے خلاف ایک عالمی سنی محاذ بنایا جائے۔ امید ہے، آپ میری معروضات پر ناراض نہیں ہوں گے اور اپنے اس اداریے کے خطرناک مضمرات پر غور فرمائیں گے۔

کل کی طرح آج بھی آپ کا نیازمند

[ڈاکٹر] ممتاز احمد

[صدر] بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محترم مدیر ماہنامہ الشریعہ

السلام علیکم۔ اللہ آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور نظر بد سے محفوظ رکھے۔

آپ بحث ومباحثہ، حالات وواقعات اور مکالموں میں اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ ہی اعتدال کی راہ ہے اور قوم کو تنگ نظری سے نکالنے کا راستہ ہے۔

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ کے ''صریر خامہ'' پر تبصرہ کے جواب میں میرا ایک مضمون ''جماعت اسلامی کے ناقدین ومصلحین'' ماہنامہ الشریعہ کے شمارے فروری میں شائع ہوا جس کی نوک پلک سنوارنے اور ایڈٹ کا فریضہ ادا کرنے سے جہاں مضمون کے حسن کو چار چاند لگ گئے وہاں کچھ ابہام بھی پیدا ہو گئے۔ مثلاً مجھے اسلامی جمعیۃ طلبہ کینٹ کا رکن لکھا گیا جبکہ میں شروع سے آخر تک ناظم ہی رہا۔ اس وقت کینٹ کا وجود ہی نہیں تھا، میں گوجرانوالہ کا ناظم تھا۔ کینٹ میں عارضی طور پر مقیم ہوں، میری رہائش پیپلز کالونی میں ہے۔ شاید اس فقرے سے بھی ابہام پیدا ہوا کہ چودھری یوسف صاحب کو جماعت وراثت میں ملی اور مجھے سوچ سمجھ اور پرکھ کر اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر میں آج تک جماعت اسلامی کا نہ رکن نہ رفیق نہ متفق رہا۔ اگرچہ ایوب خان کے خلاف پی۔ ڈی۔ ایم کے پلیٹ فارم سے جاتا رہا، گرفتاری کے فوراً ابعد کم عمری کی بنا پر چھوڑ دیا گیا، پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں شریک رہا، گوجرانوالہ کی تحریک کے دوران سب سے بڑا مقدمہ مجھ پر درج ہوا، شاہی قلعہ میں میاں محمد عثمان جو کہ دو دفعہ ایم۔ این۔ اے رہے اور ایک دفعہ ڈپٹی میئر لاہور رہے، طارق چودھری ۱۲ سال سینیٹر رہے، حافظ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مکی لشکر طیبہ کے ساتھ بھی شاہی قلعہ میں رہا، بہاولپور جیل میں میاں طفیل محمدؒ اور ایئر مارشل اصغر خان کے ساتھ رہا، وہ بھی بہاولپور جیل میں تھے۔ ہم نے شاید بہت سے لوگوں سے زیادہ جیلیں کاٹی ہیں، یہ سب کلمہ حق کہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میرے استاد محترم صوفی عبدالحمید سواتیؒ، جن کا مقام اور مرتبہ میرے نزدیک مولانا مودودیؒ سے کم نہیں ہے، کے جانشین محترم مولانا فیاض خان سواتی نے کچھ سوالات اٹھائے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''وہ کون سے سوالات تھے جن سے یہ جبال علم گھبرا جاتے تھے، وہ بھی ایک نو آموز اور مبتدی طالب علم سے۔ ہماری تو معلومات اول الذکر دونوں بزرگوں کے متعلق یہ ہیں کہ وہ اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کبھی کسی جابر سلطان کے سامنے بھی حق کہنے سے نہیں گھبرائے، اس لیے الشریعہ کی وساطت سے خواجہ صاحب موصوف کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست پیش کریں گے کہ اگر ان کی یادداشت صحیح کام کر رہی ہو تو براہ کرم ان سوالات کی لسٹ الشریعہ میں طبع کرا دیں تاکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے۔ عین ممکن ہے خواجہ صاحب موصوف کو علم ہی نہ ہو اور یہ حضرات اپنی تحریروں تقریروں اور مواعظ میں ایسے سوالات کے جوابات دے چکے ہوں۔ یہ تو بہرحال ان کے سوالات سامنے آنے پر ہی واضح ہو سکے گا۔''

جب میں صوفی عبدالحمید سواتیؒ کے پاس پڑھنے جایا کرتا تھا، میرا ذہن بالکل صاف تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ضرورت سے زیادہ ہی کرتا تھا اور مولانا غلام غوثؒ ہزاروی جو نصرۃ العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ اور شیرانوالہ باغ میں اکثر آ کر تقاریر فرمایا کرتے تھے۔ ان کا بہت معتقد تھا، بلکہ گھر کی مستورات کو بھی ان کی تقاریر سننے کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ قرآن حکیم کے بتائے گئے اخلاق کا جیتا جاگتا نمونہ تھے اور اُن کے یہ پیروکار جب اُن کے منبر پر بیٹھ کر مخالفین پر جو زبان استعمال کرتے، اس وجہ سے میں ان سے دور ہوتا گیا۔ یہ ہی سوال میں محترم صوفی عبدالحمید سواتیؒ سے کرتا کہ یہ بداخلاقی کہاں اور کس مذہب میں جائز ہے؟

سوال نمبر۱: مودودی کی لڑکیاں مخلوط اداروں میں جیب میں ایف۔ایل ڈال کر لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں۔

سوال نمبر۲: مودودی کہتا ہے میں نے سر جمال خان لغاری کو کہا ہے کہ لڑکیوں کا دھیان رکھے، اس نے اچھا ہی دھیان رکھا ہوگا۔

سوال نمبر۳: جب ۱۹۷۰ء میں ۳۱۳ علماء کا یہ فتویٰ آیا کہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنل ازم، سرمایہ داری سب کفر ہیں تو فتویٰ دینے والوں میں تمام فرقوں کے جید علمائے کرام شامل تھے جن میں مولانا رسول خانؒ ہزاروی بھی تھے جو کہ مولانا غلام غوثؒ ہزاروی کے استاد بھی تھے، مگر مولانا نے سب کو فتویٰ فروش کہا۔

سوال نمبر۴: ایئر مارشل اصغر خان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: لوگ شاہین پاکستان کہتے ہیں، میں چیل پاکستان کہوں گا۔ میجر جنرل سرفراز مرحوم کو لوگ محاذ لاہور کا ہیرو کہتے تھے، مولانا غلام غوثؒ نے فرمایا کہ میں تو ہیر کہوں گا۔

سوال نمبر۵: سابق اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ مولانا ظفر احمد انصاریؒ کو جن کی ایک ٹانگ خراب تھی، لنگڑا مودود یا کہا کرتے تھے۔

سوال نمبر۶: شیخ الحدیث مولانا محمد چراغؒ کو سیاہ دل کہا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ چراغ باہر روشنی دیتا ہے، اندر سے سیاہ ہوتا ہے۔

سوال نمبر۷: مولانا ضیاء القاسمیؒ اپنی تقریروں میں اکبر الٰہ آبادی کا مشہور شعر یوں سنایا کرتے تھے:

میں نے کہا کہ پردہ تمہارا وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مودودی کے پڑ گیا

سوال نمبر۸: مدینہ کتاب گھر کے سامنے حاجی صدر دین مرحوم ہوا کرتے تھے جو عوامی لیگ (مجیب الرحمٰن) کے لیڈروں میں سے تھے۔ ان کے بیٹے انعام الحق مرحوم خود کافی لوگوں کو بتا چکے ہیں کہ اُن کو اِس حد تک مشتعل کیا کہ وہ لاہور مولانا مودودیؒ کے گھر جہاں وہ عصر کے بعد درس دیا کرتے تھے چلے گئے اور مولانا سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا، مگر مولانا مودودیؒ مرحوم نے جس تحمل سے اسے جواب دیا، وہ اس دن سے مولانا کا گرویدہ ہو گیا۔

اگر میں لکھتا چلا جاؤں تو بہت کچھ اور بھی آئے گا۔ ان باتوں کا استاد محترم صوفی عبدالحمیدؒ سواتی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آپ کی مسجد نور سے اسلامیہ کالج جاتے ہوئے سامنے کی طرف درزیوں کی کوٹھی مشہور ہے، وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر توحید اخترؒ ہوا کرتی تھیں۔ یہ مولانا مودودیؒ کے گھر اکثر جایا آیا کرتی تھیں اور مولانا مودودیؒ کی بیٹیوں سے دوستانہ بھی تھا۔ ان کے کلینک کے آگے گلی نمبر ا گوبند گڑھ میں دوسرا مکان ان کا تھا۔ یہ پردہ نماز روزہ کی سخت پابند خاتون تھیں۔ ہمارے گھر آیا کرتی تھیں اور میری خالہ زاد بہن کی دوست بھی تھیں۔ مولانا غلام غوثؒ کی تمام باتوں کی تردید کرتی تھیں۔ اس سے مجھ پر وارثانِ محراب منبر کا یہ پہلو بھی آشکار ہوا۔ مفتی محمودؒ جب ولی خان کے اتحادی تھے اور

مولانا غلام غوثؒ ہزاروی اُن سے علیحدہ ہوئے تو اُن کے گروپ کو ہزاروی گروپ کہا جانے لگا تو انہوں نے فرمایا جو مجھے ہزاروی گروپ کہے گا میں اسے مریم جمیلہ گروپ کہوں گا۔ پھر یہ کہنا کہ مریم جمیلہ مجھے فون کرتی ہے کہ مجھے مودودی سے بچاؤ۔ ان سوالات کا دفاع کون کرے گا؟

جہاں تک مولانا عبد القیوم ہزارویؒ کا تعلق ہے، مجھے چودھری منظور صاحب جو ان دنوں جمعیۃ العلمائے اسلام کے نیشنل گارڈ کے سالار اعلیٰ تھے، پونڈاں والا مسجد میں ان کے پاس لے گئے۔ مولانا عبد القیومؒ مسجد کے صحن میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے اور آگے حدیث شریف کی ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اونچا رکھنے کو کہا تو اہل حدیث حضرات کے خلاف سخت الفاظ بولنے لگے۔ منظور صاحب نے کچھ خلافت وملوکیت کے متعلق مجھ سے بات کرنے کو کہا مگر ان کا غصہ اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے بعد ان سے کچھ کہنا اور سننا فضول تھا۔

الشریعہ کے اسی شمارے میں صفحہ ۶ پر زاہد الراشدی صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''مزاج کے سخت تھے اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے زیادہ قریب تھے اور زندگی بھر اسی فکر پر رہے''۔ اسی سختی کی وجہ سے جب پونڈاں والا کی مسجد پر بریلی مکتب فکر کے لوگوں نے قبضہ کیا تو اردگرد سے ایک بھی بندے کی حمایت مولانا کو حاصل نہ تھی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں۔

یعقوب طاہر مرحوم جماعت اسلامی کے ایک رکن تھے جو جامع مسجد نور میں نماز جمعہ پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ جب صوفی عبد الحمید سواتیؒ صاحب کبھی مولانا مودودیؒ پر تنقید کیا کرتے تو وہ جواب دینے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے قاضی مظہر حسینؒ چکوال اور سید نور الحسن بخاریؒ کی خلافت وملوکیت پر تنقید کا جواب بھی کتابی صورت میں دیا تھا۔ انہیں پکڑ کر مسجد سے نکال دیا جاتا۔ جب آپ اعتراض کرتے ہیں تو جواب بھی سن لینا چاہیے۔

پیرزادہ عطاء الحق قاسمی جو کہ مشہور کالم نگار بھی ہیں، انہوں نے اپنے ایک کالم میں جس کا عنوان تھا ''دولے شاہ کے چوہے'' لکھا ہے کہ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے اپنے اپنے مدرسوں میں طالب علموں کے بڑے بڑے دماغوں کو یوں جکڑ رکھا ہوتا ہے اور یوں برین واشنگ کی ہوتی ہے کہ وہ دولے شاہ کے چوہوں سے بھی چھوٹے رہ جاتے ہیں۔ یہی بات محترم حافظ عمار ناصر صاحب نے اس شمارے میں صفحہ نمبر ۲۷ پر مشعل سیف کو انٹرویو کے دوران کہی ہے:

''عام طور پر کسی بھی مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ایک خاص نوعیت کے مسلکی رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں۔''

فیاض خان سواتی صاحب بھی میرے لیے محترم ہیں۔ ان کے کہنے پر کچھ سوالات لکھ دیے ہیں، اب اس پر مزید کچھ نہیں لکھوں گا۔ صوفی عبد الحمیدؒ سواتی صاحب پاکستان کے جید، باکردار اور صاحب عمل علماء میں سے تھے۔ ہمارے دل میں ان کا بہت مقام ہے۔ سوالات پوچھنا، غلط فہمیاں دور کرنا اور مطمئن ہونا ہر طالب علم کا حق ہوتا ہے جو مدرسے والے استعمال نہیں کرنے دیتے۔ اگر میں نے یہ کام کیا تو کوئی جرم نہیں کیا۔

خواجہ امتیاز احمد

سابق ناظم اسلامی جمعیۃ طلبہ گوجرانوالہ

محمد بلال فاروقی*

الشریعہ اکادمی کا دورۂ تفسیر۔ مشاہدات وتاثرات

قرآن مجید اللہ کا آخری پیغام اور کتاب ہدایت ہے۔ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ یہ نسل انسانی کے تمام طبقات سے خطاب کرتا ہے۔ ایک طرف اس کے معانی ومطالب اتنے وسیع اور گہرے ہیں کہ ذکی ترین آدمی ان میں عواصی کر کے احکام ومسائل اور حقائق کے لعل وجوہر نکالتا ہے۔ دوسری طرف قرآن کا دعوتی وتذکیری پہلو ایک عام انسان کی بھی بڑے دل نواز انداز میں راہنمائی کرتا ہے۔ بنیادی عقائد (توحید، رسالت، آخرت) کو ایسے سادہ پیرایے میں بیان کرتا ہے کہ ہر انسان اس کے موثر اسلوب سے اپنے ظرف کے بقدر استفادہ کر سکتا ہے۔ قرآن کریم کے حقائق ومعانی اور احکام ومسائل کا استنباط واستخراج تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے علوم اسلامیہ کی تحصیل وتکمیل کی ہو اور قرآن کے فہم ومطالعہ میں عمر کا ایک معتد بہ حصہ گزارا ہو، البتہ اس کے دعوتی وتذکیری پہلو سے ہر آدمی استفادہ کرتا ہے۔

۱) خاندان ولی اللہی کی خدمات قرآنیہ:

بارہویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ سیادت وحکومت نا اہل اور عیاش لوگوں کے ہاتھ میں تھی تو مذہبی تعلیم میں قرآن وحدیث کے بجائے علوم عقلیہ مہارت کا معیار تھے۔ قرآن و حدیث کی طرف علماء کی توجہ بہت کم تھی۔ حفاظ اگرچہ ہوتے تھے، لیکن قرآن مجید کے ترجمہ سے مناسبت صرف علماء کو ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں امام شاہ ولی اللہؒ نے مسلمانوں کی دینی تعمیر وترقی کے لیے ایک اصلاحی تحریک شروع فرمائی۔ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے لیے ضروری تھا کہ اس کی بنیاد وحی الٰہی کتاب اللہ کو قرار دیا جائے، اس لیے شاہ صاحب نے لوگوں کا تعلق قرآن مجید سے جوڑنے کے لیے کوششیں شروع فرمائیں۔ تمام تر مخالفت کے باوجود شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے مدرسے کے نصاب میں ترمیم کی اور درس قرآن کو تعلیم کا لازمی جزو بنایا۔

اس سلسلے کو بعد میں شاہ صاحب کے صاحبزادوں نے جاری رکھا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیز نے تفسیر عزیزی لکھی۔ جب فارسی کا دائرہ محدود ہونے لگا اور عوام میں اردو زبان ترویج پانے لگی تو شاہ صاحب کے دو صاحبزادوں نے اردو میں قرآنی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ حضرت

* شریک دورۂ تفسیر الشریعہ اکادمی (۲۰۱۱ء) bilalfarooqi2004@gmail.com

شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح قرآن کے نام سے ترجمہ ومختصر حواشی لکھے۔ یہ ترجمہ وتفسیر علامہ شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ ان تراجم کے بارے میں شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

''مولانا شاہ ولی اللہ، مولانا رفیع الدینؒ اور مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے تراجم کو جب غور سے دیکھا تو یہ امر بلا تامل معلوم ہو گیا کہ اگر متقدمین اکابر قرآن مجید کی اس خدمت کو انجام نہ دیتے تو اس شدت ضرورت کے وقت ترجمہ کرنا بہت دشوار ہوتا۔ علماء کو صحیح ترجمہ اور معتبر ترجمہ کرنے کے لیے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت سی فکر کرنا ہوتی۔ ان وقتوں کے بعد بھی شاید ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔'' (مقدمہ ترجمہ قرآن)

حضرت شیخ الہند کی خدمات قرآنیہ:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد انگریز مسلم دشمنی میں حد سے گزر گئے۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ مسلمانوں میں جذبہ جہاد ختم کرنے اور انھیں قرآن سے دور کرنے کے لیے انگریزی تعلیمی اداروں اور مشنریوں کا جال بچھا دیا گیا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریک کے اس وقت کے امام، قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جس کی اس خطے میں کوئی مثال نہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد حضرت شیخ الہند نے اس تحریک کو بام عروج تک پہنچایا اور جگہ جگہ مکاتب قرآنیہ قائم فرمائے۔ دیوبند کے فضلاء کی ایک باقاعدہ تنظیم جمعیت الانصار اس مقصد کے لیے قائم فرمائی جبکہ دہلی میں ادارہ نظارۃ معارف قرآنیہ قائم فرمایا۔ حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ نظارہ معارف قرآنیہ کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے خیالات وعقائد پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر شروع ہے، اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک وشبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان بن جائیں۔ (نقش حیات، صفحہ نمبر ۵۵۵)

حضرت شیخ الہندؒ نے خدمات قرآنیہ کے حوالے سے دو بڑے کارنامے انجام دیے۔ ایک آپ کا ترجمہ قرآن ہے جو بعد میں ہونے والے تقریباً تمام اردو تراجم کے لیے بنیاد بنا اور دوسرا آپ نے اپنے شاگردوں کے اندر قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کا جذبہ پیدا فرمایا۔ مالٹا سے واپسی پر مسلمانوں کے اسباب زوال میں سے قرآن سے دوری کو بڑا سبب قرار دے کر اپنے شاگردوں کو قرآنی تعلیمات عام کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے شاگرد جہاں بھی گئے، وہاں محفل قرآن سجا دی۔ حضرت سندھی دہلی گئے تو نظارہ معارف قرآنیہ وجود میں آیا۔ حضرت مدنی نے جیل میں حلقہ درس لگا دیا۔ حضرت تھانوی نے تھانہ بھون میں محفل جمائی۔

قیام پاکستان کے بعد اس اصلاحی تحریک کے کارکنوں نے مسلمانان پاکستان میں تعلیمات قرآنیہ عام کرنے کے لیے دورۂ تفسیر کا آغاز فرمایا۔ حضرت لاہوریؒ نے (جو خود نظارہ معارف قرآنیہ کے فاضل تھے) نے لاہور میں، حضرت درخواستی نے خانپور میں، مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے گوجرانوالہ میں، ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے لاہور میں، ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے صوبہ سرحد میں اور دوسرے بہت سے حضرات نے مختلف مقامات پر پر دورۂ تفسیر کا اجرا فرمایا۔

امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ:

امام شاہ ولی اللہؒ کے دو سلسلوں (بواسطہ شیخ الہند اور بواسطہ حضرت مولانا حسین علی) کے جامع، امام اہل سنت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا سرفراز خان صفدرؒ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد گکھڑ میں آئے اور قرآن کریم کی ایسی خدمت کی جو شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آئی ہو۔ ۱۹۴۳ء سے ۲۰۰۱ء تک یعنی پورے ۵۸ برس اپنی مسجد میں درس قرآن دیا، جبکہ ۱۹۴۳ء سے ۲۰۰۱ء تک گورنمنٹ ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ گکھڑ میں درس قرآن دیتے رہے جس میں اسکول و کالج کے اساتذہ و پروفیسر حضرات شریک درس ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۶ء تک جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں شعبان ورمضان کی سالانہ تعطیلات میں دورۂ تفسیر بھی پڑھاتے رہے۔ درس قرآن کے حوالے سے حضرت شیخ کا تجدیدی کارنامہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ترجمہ وتفسیر کا مستقل سبق شروع کرنا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ صبح سب سے پہلا سبق ترجمہ وتفسیر کا ہوتا تھا جس میں درجہ ثالثہ سے دورۂ حدیث تک کے تمام طلبہ شریک ہوتے۔ ۴۵ منٹ کا پیریڈ ہوتا اور ایک سال میں پندرہ پارے مکمل فرماتے۔ چونکہ اس سبق میں روزانہ رکوع سوا رکوع کا درس ہوتا تھا، اس لیے حضرت تفصیل سے تفسیری نکات بیان فرماتے تھے۔ باوجود ضعف وعلالت کے یہ سلسلہ ۲۰۰۱ء تک چلتا رہا۔

حلقہ ہائے درس میں آپ مخاطبین کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے تھے۔ اگر سامعین عوام ہیں تو انداز بیان سادہ اور ناصحانہ ہوتا۔ اگر مجمع طلبہ وعلماء کا ہوتا تو محققانہ ابحاث ارشاد فرماتے۔ ہر بات باحوالہ بیان کرتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سامع کسی بڑی لائبریری میں بیٹھا ہے۔ باوجود پٹھان ہونے کے آپ عوام کے لیے پنجابی میں درس ارشاد فرماتے تھے اور عقائد کی تصحیح اور بدعات ورسوم کی اصلاح پر آپ کی خاص توجہ ہوتی تھی۔

جب آپ آئے تو گکھڑ شرک و بدعت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن آپ کی محنت سے توحید کی شمع روشن ہوئی۔ اس جدوجہد میں آپ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، لیکن آپ پامردی سے اپنا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ہمیشہ داعیانہ و ناصحانہ انداز اختیار فرماتے تھے، کبھی مناظرانہ اسلوب اختیار نہیں فرمایا۔ عبادات کے بعد آپ معاملات ومعاشرت کی اصلاح پر خصوصی توجہ دیتے۔ حقوق العباد کی اہمیت سمجھانے کے لیے آپ اکثر ایک واقعہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حوالے سے سنایا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ ایک آدمی فوت ہوگیا۔ خواب میں اسے کسی نے دیکھا تو پوچھا، بھئی کیا معاملہ ہوا؟ اس نے جواباً کہا کہ سزا تو نہیں ملی، لیکن جنت کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔ پوچھا گیا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ کہا کہ میں نے کپڑے سینے کے لیے اپنے ہمسایے سے ایک سوئی لی تھی جو واپس نہیں کی۔ جب تک میرے ورثا واپس نہیں کریں گے، تب تک میں جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔

علماء وطلبہ کے حلقہ میں آپ ہر موضوع پر محققانہ بحث فرماتے۔ لغات قرآن کے حل کے لیے قاموس، تاج العروس اور منتہی الارب جیسی کتابوں کے حوالے دیتے۔ صرفی ونحوی اشکالات کو سہل انداز میں حل فرماتے۔ شاذ ومردود اقوال کو بیان کر کے ان کے شاذ اور مردود ہونے کی وجہ بھی بیان فرماتے۔ قرآن کریم کے بیان کردہ جغرافیائی مقامات کی وضاحت تاریخ ارض قرآن (سید سلیمان ندویؒ) یا قصص القرآن (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ) سے فرماتے۔ اس

کے علاوہ یہ دروس بے شمار خصوصیات کے حامل ہوتے جن سے ہر کوئی اپنے ظرف کے بقدر فیض پاتا رہا۔ (ملخص از ''حضرت شیخ الحدیث کا تفسیری ذوق اور خدمات'' از مولانا محمد یوسف صاحب، ماہنامہ ''الشریعہ''، امام اہل سنت نمبر)

مفسر اعظم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ:

آپ کے برادر صغیر مولانا عبد الحمید سواتی شارح علوم ولی اللہی بھی اپنے بڑے بھائی سے پیچھے نہ رہے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنوی سے تقابل ادیان پڑھا اور طب کی تعلیم طبیہ کالج حیدر آباد دکن سے حاصل کی۔ روحانی وجسمانی بیماریوں کے اس معالج نے ۱۹۵۲ء میں گوجرانوالہ میں مسجد نور اور مدرسہ نصرۃ العلوم کی بنیاد رکھی اور قرآنی خدمات میں مشغول ہو گئے۔ مسجد نور میں آپ نے عوام الناس کے لیے درس قرآن کے سلسلے کا آغاز کیا۔ یہ دروس اب ''معالم العرفان فی دروس القرآن'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ کا ان دروس پر تبصرہ یہ ہے کہ ''جس توسع سے آیات کریمہ کی تشریح کی گئی ہے، اس پر تفسیر عزیزی کا گمان ہوتا ہے۔''

حضرت سواتیؒ اپنے دروس میں قرآن کریم کو بطور فلسفہ حیات پیش فرماتے ہیں۔ جملہ نظام ہائے زندگی پر بحث کرتے ہیں۔ معاشیات ہو یا سیاسیات، جمہوریت ہو یا ملوکیت، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا جاگیردارانہ، تمام نظاموں کی خرابیوں کو طشت از بام کر کے قرآن کریم کو بطور نظام زندگی پیش کرتے ہیں اور قرآن کے انقلابی پروگرام سے روگردانی کے بھیانک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ امام ولی اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے انداز میں حکمت وفلسفہ سمجھاتے ہیں۔ انداز بیان سادہ اور پیرایہ دلنشین ہوتا ہے۔ دوران درس اقوام عالم کے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور موجودہ سیاسی وسماجی حالات پر جامع تبصرہ فرماتے ہیں۔ ادبی وکلامی مباحث کے بجائے وہ قرآن کے دعوتی وتذکیری پہلو پر توجہ دیتے نظر آئے ہیں۔ متنازعہ افکار واقوال سے گریز کرتے ہوئے فقہی مسائل واحکام میں برداشت وتحمل کی دعوت دیتے ہیں۔ (ملخص از مقالہ ایم فل مولانا وقار احمد صاحب)

مفکر اسلام حضرت مولانا زاہد الراشدی:

مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے صاحبزادے اور مولانا سواتیؒ کے بھتیجے مولانا زاہد الراشدی ان دونوں شخصیات کے حقیقی جانشیں ہیں۔ تحریک، تحریر اور تدریس کے شاہ سوار ہیں۔ عصر حاضر کے موضوعات ومباحث کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اور اس حوالے سے اخبارات وجرائد میں ہزاروں صفحات سپرد قلم کر چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء کے بعد سے آپ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے تین بڑے مناصب (شیخ الحدیث، ناظم تعلیمات، صدر مدرس) کے عہدہ پر فائز ہیں اور بخاری شریف، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق پڑھاتے ہیں۔

الشریعہ اکادمی کا دورۂ تفسیر:

شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر نے جامعہ نصرۃ العلوم میں ترجمہ وتفسیر کا جو سبق طلبہ کے لیے شروع کیا تھا، ۲۰۰۱ء کے بعد سے وہ مولانا زاہد الراشدی کے ذمے ہے۔ گزشتہ دو سال سے علامہ زاہد الراشدی نے ۱۹۹۶ء سے ٹوٹے ہوئے سالانہ دورۂ تفسیر کے سلسلے کو دوبارہ جوڑا ہے اور اپنے ادارے الشریعہ اکادمی میں دورۂ تفسیر کا آغاز فرمایا

ہے جو کامیابی سے جاری وساری ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق حضرت نے دورہ کی افادیت کو بڑھانے کے لیے اس میں کئی نئے اور مفید پہلو شامل کیے ہیں۔ راقم الحروف کو بھی اکادمی کے دورۂ تفسیر میں شرکت کا موقع ملا۔ ذیل میں، اپنے مشاہدات کی روشنی میں ترجمہ وتفسیر کے اساتذہ اور ان کے ذوق تفسیر کا اجمالی تعارف اور محاضرات قرآنیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

عام طور پر دورۂ ہائے تفسیر میں ایک ہی بزرگ عالم دین پورے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر پڑھاتے ہیں جس میں صرف ایک ہی طرز کے منہج تفسیر اور ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ الشریعہ اکادمی کے دورہ تفسیر میں چار پانچ اساتذہ تدریس کرتے ہیں جس کی وجہ سے مختلف مناہج سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور مختلف اذواق کا پتہ چلتا ہے۔ اکادمی کے دورۂ تفسیر میں محاضرات علوم قرآنیہ کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ صبح ترجمہ وتفسیر کا سبق ہوتا ہے جبکہ ظہر کے بعد علوم قرآنیہ میں سے کسی موضوع پر محاضرہ ہوتا ہے جس میں علوم قرآنیہ کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مفکر اسلام مولانا زاہد الراشدی قرآن کریم کا عمومی ترجمہ وتفسیر اپنے والد محترم کے طرز پر سمجھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات اور اہل مغرب کے فکری مغالطوں کا مدلل جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ احکام القرآن اور عالمی قوانین کا موازنہ کرتے ہیں۔ عالمی قوانین کی کمزوریوں کو افشا کرتے اور قرآن کے احکام کو دلائل سے قابل عمل ثابت کرتے ہیں۔ مغربی انسانی حقوق کے بالمقابل اسلامی انسانی حقوق کا تصور پیش کرتے ہیں۔ حقوق النساء کے حوالے سے پیدا کی جانے والی گمراہیوں کا مدلل انداز محاکمہ کرتے ہیں۔ احکام القرآن کے ضمن میں پاکستان اور پوری دنیا میں کی جانے والی علماء کی جدوجہد کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔

مولانا ظفر فیاض صاحب گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ درس نظامی کی تکمیل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے کی اور یہیں دینی علوم کی تدریس بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے تفسیر مولانا سرفراز خان صفدرؒ سے اور ولی اللہی علوم حضرت سواتی سے پڑھے ہیں۔ قدیم وجدید موضوعات کا یکساں مطالعہ رکھتے ہیں۔ دوران درس ترجمہ سمجھانے پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور سلیس اور عام فہم ترجمہ اور مختصر لیکن جامع تفسیر بیان کرتے ہیں۔ امام اہل سنت کی طرز پر آیات اور سورتوں کا ربط بیان فرماتے ہیں۔

مولانا فضل الہادی صاحب بٹگرام سے تعلق رکھتے ہیں اور مانسہرہ میں ہی تدریس کرتے ہیں۔ تعلیم کا اکثر عرصہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں گزارا اور سند فراغت جامعہ دارالعلوم کراچی سے حاصل کی۔ تفسیر اجمالاً (سالانہ دورۂ تفسیر میں) و تفصیلاً (دوران سال میں ترجمہ وتفسیر) امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر سے پڑھی ہے۔ عربی زبان وادب میں مہارت رکھتے ہیں۔ فی البدیہہ عربی نظمیں اور قصائد کہتے ہیں اور علم میراث تو ان کی جیب کی گھڑی ہے۔ پیچیدہ ترین مسائل منٹوں میں حل فرما دیتے ہیں۔ سبق ایسے پڑھاتے ہیں کہ کلاس میں ہی طلبہ کو یاد ہو جاتا ہے۔ حضرت نے ہمیں پہلے دس پارے پڑھائے۔ پہلے حافظ الحدیث حضرت درخواستیؒ کے طرز پر مضامین قرآنیہ کی تقسیم فرماتے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرۃ کے مضامین کی تقسیم یوں فرمائی: ایک مقدمہ، تین مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پھر مقاصد کو آگے ابواب میں تقسیم کر کے پوری سورت کا خلاصہ بیان فرما دیتے ہیں۔ اس کے بعد عمومی تفسیر وترجمہ حضرت امام اہل سنت کے طرز پر

سمجھاتے ہیں۔شاہ ولی اللہ کے علوم خمسہ (علم الاحکام، علم مجادلہ، تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بذکر الآخرۃ) کے مطابق ہر آیت کا عنوان بتاتے ہیں۔ ماقبل سے ربط حضرت مولانا سرفراز صفدرؒ اور حضرت تھانویؒ کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں۔ہم نے استاذ مکرم کی علم میراث پر مہارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نماز مغرب کے بعد سراجی بھی پڑھ لی۔

مولانا محمد عمار خان ناصر، مولانا سرفراز خان صفدر کے پوتے اور علامہ زاہد الراشدی کے بیٹے ہیں۔ انتہائی قابل، وسیع المطالعہ اور ذی فہم مدرس ہیں۔حدیث وتفسیر، فقہ وکلام، منطق وفلسفہ قدیم وجدید پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ دس سال سے زائد عرصہ تک جامعہ نصرۃ العلوم میں تدریس کی۔آج کل گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں ایم فل کے طلبہ کو تدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف میں مشغول ہیں۔اس کے علاوہ ماہنامہ الشریعہ جیسے علمی وتحقیقی مجلّہ کے منصب ادارت پر فائز ہیں۔مولانا، نظم قرآنی پر مہارت رکھتے ہیں۔مضامین قرآنی کو ایسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ موتیوں کی لڑی ہو۔عربی واردو ادب پر دسترس رکھنے کی وجہ سے ترجمہ انتہائی سلیس اور عام فہم کرتے ہیں۔ بلاغت قرآنی کو بڑے سہل انداز میں سمجھاتے ہیں۔آیات کی تفسیر متقدمین مفسرین کے منہج کے مطابق بیان فرماتے ہیں۔ان کے درس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دوران سبق میں تدبر قرآنی کی عملی تربیت بھی دیتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب، شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر سے فیض یافتہ اور جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل ہیں۔ترجمہ وتفسیر میں امام اہل سنت کا طرز اختیار فرماتے ہیں۔ربط بھی حضرت کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں۔اس کے علاوہ حضرت کا خصوصی ذوق تفسیر بالحدیث ہے۔تقریباً ہر آیت کی تفسیر میں حدیث ذکر کرتے ہیں اور اس میں اکثر تفسیر ابن کثیر کا حوالہ ارشاد فرماتے ہیں۔

محاضرات قرآنیہ:

الشریعہ اکادمی کے دورۂ تفسیر کی دوسری خصوصیت محاضرات علوم قرآنیہ ہیں۔نماز ظہر کے بعد ہر ہفتے میں دو یا تین محاضرات ہوتے ہیں۔دورہ تفسیر کے پہلے سال قرآن کا دعوتی وتذکیری پہلو، مناہج تفسیر، قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات، ختم نبوت، انسانی حقوق کا عالمی چارٹر، شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی خدمات قرآنیہ، ناسخ ومنسوخ اور اصول فقہ کے موضوعات پر محاضرات کا اہتمام کیا گیا۔

''قرآن کریم کا دعوتی وتذکیری پہلو'' کے عنوان پر محاضرہ میں مولانا عمار خان ناصر نے یہ نکتہ واضح فرمایا کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے شخص کے پیش نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ قرآن کریم بنیادی طور پر ایک کتاب تذکیر ہے اور اس سے تذکیر حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن کے متن پر توجہ مرکوز رکھیں اور زائد تفصیلات میں الجھنے سے حتی الامکان گریز کریں۔مولانا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی مثال دی کہ اگر اس کو قصہ وکہانی کے انداز میں دیکھا جائے تو کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم صرف ان پہلوؤں کو ذکر کرتا ہے جو تذکیر کے پہلے سے مقصود ہیں۔اسی طرح حضرت یوسفؑ کا واقعہ اگرچہ تفصیلی ہے، لیکن وہی امور مذکور ہیں جن سے انسان کی تربیت مقصود ہے۔

ڈاکٹر اکرم ورک صاحب نے ''قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات'' کے عنوان پر لیکچر دیا۔ڈاکٹر اکرم ورک صاحب الشریعہ اکادمی کے قدیم رفقاء میں سے ہیں۔پنجاب یونیورسٹی سے اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور

مستشرقین کے نظریات ان کے مطالعہ وتحقیق کا خاص موضوع ہے۔ان کا وقیع مقالہ ''متون حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات'' کے زیر عنوان کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے پہلے استشراق کی تاریخ کو بیان کیا۔اس کے بعد چند مغربی مستشرقین اور ان کی کتب کا تعارف کروایا اور طلبہ میں اس موضوع پر مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید متین شاہ صاحب، جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کے فاضل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔نہایت وسیع المطالعہ نوجوان عالم دین ہیں۔مولانا نے تقریباً دس مناہج تفسیر مثلاً (اصلاحی، کلامی، بلاغی وغیرہ) کا تعارف کرایا اور پھر ان مناہج پر لکھی جانے والی کم از کم تین تین تفاسیر کا ذکر کیا۔ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا یہ محاضرہ اتنا مدلل اور پرمغز اور انداز بیان اتنا خوبصورت تھا کہ وقت گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب عصر کی اذان شروع ہوئی اور مولانا کو محاضرہ ختم کرنا پڑا۔

مولانا مشتاق احمد چنیوٹی صاحب نے ''ختم نبوت'' کے موضوع پر دو محاضرے ارشاد فرمائے۔مولانا، حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی صاحب کے ادارہ مرکزیہ دعوۃ والارشاد میں تخصص فی ردالقادنیۃ کے نگران ہیں اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔مولانا نے مرزا کی شخصیت، اس کے دعاوی، حیات عیسیٰ اور مرزا قادیانی کے قرآن سے استدلالات کے حوالے سے مفصل گفتگو فرمائی۔

استاذ مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ''انسانی حقوق کا عالمی چارٹر'' کے موضوع پہ بیان فرمایا۔استاذ محترم اس موضوع پر اتھارٹی ہیں۔اس موضوع پر آپ درجنوں محاضرات اور تفصیلی مضامین لکھ چکے ہیں۔مولانا نے چارٹر کی ان شقوں کو اپنا موضوع بنایا جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ان کی کمزوری کو بیان کیا اور پھر اسلامی نظریہ کو دلائل سے قابل عمل اور راجح ثابت کیا۔

حافظ نصیر احمد احرار صاحب جامعہ اشرفیہ کے فاضل ہیں اور جمعیت طلبہ اسلام کے مرکزی صدر رہ چکے ہیں۔برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر وسعت مطالعہ کے حامل ہیں۔انھوں جماعت شیخ الہند کی خدمات قرآنیہ کو تفصیلاً بیان فرمایا۔ محاضرہ کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوئی جس میں دو قومی نظریہ کے حوالے سے دلچسپ مباحثہ ہوا۔

مولانا وقار احمد صاحب مدرسہ نصرۃ العلوم کے فاضل ہیں اور اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے مولانا عبدالحمید سواتیؒ کی تفسیری خدمات پر مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کر چکے ہیں۔مولانا، الشریعہ اکادمی کے دورۂ تفسیر کے ناظم بھی ہیں۔مولانا نے نسخ کی تعریف، مقصد اور فلسفہ بیان کرنے کے بعد متعلقہ آیات کے حوالے سے متاخرین علماء میں سے امام شاہ ولی اللہ کی بیان کردہ توجیہات کو سمجھایا۔

مولانا حافظ محمد رشید صاحب اکادمی کے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔دارالعلوم کراچی کے فاضل ہیں اور گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ سے علوم اسلامیہ میں ایم فل کر چکے ہیں۔مولانا نے ''حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی تصانیف میں اصول فقہ کی مباحث'' کے موضوع پر مقالہ لکھا ہے۔اپنے مقالہ کی روشنی میں اصول فقہ کی مبادیات کا ذکر کرنے کے بعد مولانا سرفراز خان صفدر کی تصانیف میں سے متعلقہ مباحث کی تلخیص بیان فرمائی ہے۔

جامعہ ابو ہریرہ، نوشہرہ کے مہتمم اور معروف مصنف ومحقق حضرت مولانا عبد القیوم حقانی صاحب کا ایک محاضرہ طے تھا، لیکن وہ کسی عذر کی بنا پر تشریف نہ لا سکے، البتہ انہوں نے اپنی کتابوں کا سیٹ طلبہ کے لیے بھجوایا۔

دورۂ تفسیر کے ضمن میں ایک سعادت یہ بھی حاصل ہوئی کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ نے احادیث مسلسلات کی اجازت ہمیں عنایت فرمائی۔

اکادمی کی انتظامیہ نے طلبہ کے لیے اہل علم سے ملاقاتوں کا اہتمام بھی کیا۔ ایک موقع پر طلبہ، حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب گورمانی (دامت برکاتہم العالیہ) کے پاس حاضر ہوئے۔ باوجود ضعف وعلالت کے حضرت نے عصر سے مغرب تک ہمارے ساتھ گفتگو فرمائی اور کئی نصائح ارشاد فرمائے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، مولانا سرفراز خان صفدرؒ اور مولانا سواتیؒ کے ساتھ گزرے وقت کی یادیں بھی بیان فرمائیں۔ آخر میں دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا۔ اس کے بعد شرکاء دورۂ تفسیر کو جامعہ نصرۃ العلوم لے جایا گیا جہاں حضرت مولانا عبد القدوس قارن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حضرت بڑے تپاک سے ملے۔ ان دنوں حضرت کی طبیعت ناساز تھی۔ ہمیں بھی دعاؤں کے لیے کہا اور خود ہمارے لیے بھی دعائیں کیں۔ مولانا قارن سے اجازت لے کر ہم جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا فیاض خان سواتی صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت نے کمال شفقت سے سب کا تعارف پوچھا اور حال احوال دریافت کیا۔ آخر میں اپنے تحریر کردہ دو رسائل ہمیں عطا فرمائے۔

اکادمی کی انتظامیہ کا رویہ طلبہ کے ساتھ انتہائی مشفقانہ اور دوستانہ تھا۔ مولانا وقار احمد صاحب (ناظم دورۂ تفسیر) اور مولانا محمد رشید صاحب طلبہ کی حوصلہ افزائی فرماتے، مطالعہ کا شوق ابھارتے اور طلبہ کے آرام کا مکمل خیال رکھتے ہیں، یہاں تک کہ کھانے کا مینو بھی طلبہ کے مشورہ سے مقرر کیا جاتا ہے۔

دورۂ تفسیر کے اختتام پر ایک سادہ اور پروقار تقریب منعقد ہوئی جس میں استاد مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب نے بیان فرمایا اور طلبہ کو اکادمی کی مطبوعات کا ایک ایک سیٹ عنایت فرمایا۔ اکادمی کی یہ کوشش انتہائی قابل قدر اور مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو جاری وساری رکھے اور اس کے فیض کو پھیلاتا رہے۔ (آمین)

معدہ جگر کے مریضوں کے لیے خوش خبری

ہیپاٹائٹس اور معدہ وجگر کی اصلاح کے لیے جڑی بوٹیوں سے ایک مجرب نسخہ تیار کیا گیا ہے۔ ان امراض میں مبتلا حضرات رابطہ کر سکتے ہیں:

حکیم محمد عمران مغل بی اے (مستند درجہ اول، طبیہ کالج، لاہور)

0333-4058503

تعارف وتبصرہ

ابوعمار زاہد الراشدی

''صاحب قرآن''

مصنف: ڈاکٹر محمد شکیل اوج
ناشر: شعبہ سیرت، جامعہ کراچی۔
صفحات: ۔ قیمت: ۳۵۰۔

آج کی دنیا میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت کے ہمارے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ بھٹکی ہوئی بلکہ مسلسل بھٹکتی ہوئی انسانی سوسائٹی کو آسمانی تعلیمات اور فطرت سلیمہ کی طرف واپس لانے کے لیے قرآن کریم اور سنت نبوی کو عصر حاضر کی زبان واسلوب اور نفسیات وضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے پورے شعور وادراک کے ساتھ پیش کیا جائے اور لادینی تہذیب وتعلیم نے قرآن وسنت کی تعلیمات کے گرد شکوک وشبہات کا جو وسیع جال پھیلا رکھا ہے، انسانی ذہن کو حکمت وتدبر کے ساتھ اس دام ہم رنگ زمین سے نکالنے کی جدوجہد کی جائے۔

محترم ڈاکٹر محمد شکیل اوج کی علمی وفکری کاوشیں وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور خوشی ہوتی ہے کہ وہ بھی ارباب فکر ودانش کے اس قافلے میں شامل ہیں جو اس شعور سے نہ صرف بہرہ ور ہے بلکہ اس کے مطابق پیش رفت بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ زیر نظر کتاب ''صاحب قرآن'' ان کے چند مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بعض پہلوؤں کے بارے میں ہیں اور ان کے حسن ذوق اور سعی ومحنت کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالنے کی سعادت حاصل کی ہے اور یہ دیکھ کر میری مسرت میں اضافہ ہوا ہے کہ نتائج فکر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود ان کی تحقیق وجستجو کا رخ صحیح سمت میں ہے اور عصر حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے ادراک کا پس منظر رکھتا ہے۔

سیرت طیبہ کے بارے میں کوئی بھی علمی کاوش حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی اور اس میدان میں خوب سے خوب تر کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی، لیکن مبارک باد کے مستحق ہیں وہ اصحاب علم ودانش جو اس خوب تر کی تلاش میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت وعقیدت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ نسل انسانی کی راہ نمائی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)

حکیم محمد عمران مغل بی اے

خسرہ کا مجرب علاج

خسرہ ایک متعدی مرض ہے۔اس کا تعلق ایک مخصوص وائرس سے ہوتا ہے۔صفراوی مزاج رکھنے والے بچے فوری اس کی زد میں آتے ہیں۔اس کے ساتھ بخار بھی لازمی ہوتا ہے۔نزلہ، زکام، کھانسی کی شکایت ہوتی ہے۔پھر چوتھے دن جسم پر خشخاش یا باجرہ نما باریک دانے ظاہر ہوتے ہیں جو آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔زبان پر سفید تہہ جم جاتی ہے۔کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔مزاج حد درجہ چڑچڑا ہو جاتا ہے اور بھوک ختم ہو جاتی ہے۔تین دن کے یہ دانے ڈھلنے لگتے ہیں۔دانے ختم ہونے کے بعد باریک بھوسی جسم سے اترنے لگتی ہے۔بچے کا پیشاب گاڑھا اور سرخ ہو جاتا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ اگر بچے کو سردی لگ جائے تو پہلے اس کا تدارک کریں اور درج ذیل مقوی قلب ادویہ دیں: خمیرہ مروارید، چھوٹا چمچ نصف صبح شام سادہ پانی یا عرق گاؤزبان سے دیں۔کھانسی بار بار ستائے تو لعوق سپستان آدھا چمچ دن میں چار مرتبہ چٹائیں۔یہ تیار شدہ ادویہ ہیں جو آپ سفر وحضر میں بلاخوف دے سکتے ہیں۔

ذیل میں میرا ایک مجرب نسخہ درج ہے۔اسے خود تیار کر کے بچے کو دیں۔

<u>ہوالشافی:</u> خاکسی، ایک چھوٹا چمچ۔یہ خشخاش کی طرح باریک باریک دانے ہوتے ہیں۔تھوڑی سی ملٹھی، تقریباً ایک آدھ انچ۔دو سے چار دانے عناب کے (توڑ کر)۔یہ سب چیزیں ایک یا ڈیڑھ گلاس پانی میں دو تین جوش دے کر ٹھنڈا کر لیں۔مناسب سمجھیں تو شہد یا چینی سے مزید میٹھا کر لیں اور سوتے وقت پلا دیں۔صبح اللہ کے فضل سے کملایا ہوا پھول کھلکھلایا ہوا لگے گا۔خوراک دن میں دو بار بھی دے سکتے ہیں۔قرشی یا کسی بھی اچھے دواخانہ کے شربت عناب کا بڑا چمچ صبح شام پلا دیا کریں۔

یہ نسخہ پرانے اطبا نے زندگی بھر کی محنت شاقہ سے ترتیب دیا ہے۔میں تیس سال سے صرف اور صرف یہی نسخہ استعمال کر رہا ہوں۔آج تک اللہ نے ناکامی نہیں دکھائی۔یاد رکھیں، کھانسی، نزلہ، زکام، بخار، خسرہ اگر خدانخواستہ بگڑ گیا تو بچے کی ساری زندگی برباد ہو جائے گی۔دوران مرض میں ہوا اور پانی کی تبدیلی بلاوجہ نہ کریں اور عام جسمانی کمزوری کا بھی خیال رکھیں۔مرطوب ہوا بھی نہ ہو۔خمیرہ مروارید آب حیات سمجھ کر دیتے رہیں۔دلیہ، ساگودانہ، کھچڑی، کالے چنے، جس چیز میں بھی بچہ رغبت محسوس کرے، دے دیں۔خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا سونے پر سہاگہ ہے۔مریض کو بازار کی کوئی چیز نہ دیں۔جب مرض کی شدت ختم ہو جائے تو بکرے کی اوجھڑی کا سالن دیں۔